زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

ستمبر ۲۰۱۷ء

۱۰ روپئے

جابر حسین رئیس الشاکری وقار رضوی پروفیسر عبدالخالق رشید جواہر چودھری عبیداللہ ناصر

فضل حسنین ملک زادہ جاوید ڈاکٹر عادل حیات نیلوفر حفیظ عرفان علی ترنم جہاں شبنم عبیداللہ چودھری

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (ستمبر)

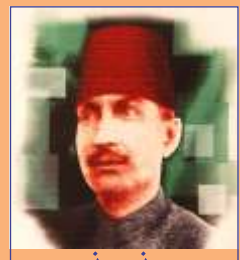
فانی بدایونی

کلیم الدین احمد

ممتاز شیریں

ثمینہ راجہ

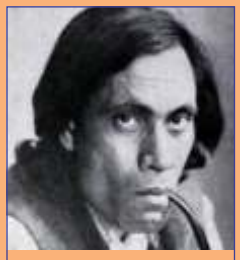
صابر دت

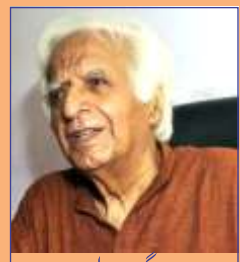
جوگیندر پال

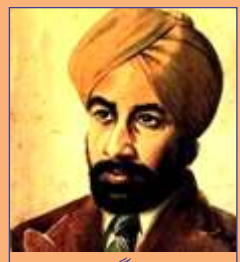
راجیندر سنگھ بیدی

پرویز شاہدی

بلراج کومل

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

حبیب تنویر

خمار بارہ بنکوی

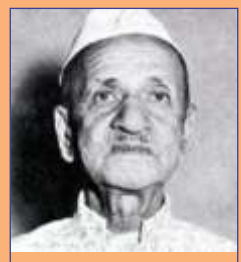
نوح ناروی

آل احمد سرور

رئیس امروہوی

راجیندر سنگھ بیدی	یکم ستمبر ۱۹۱۵ء	۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء
حبیب تنویر	یکم ستمبر ۱۹۲۳ء	۸ر جون ۲۰۰۹ء
فاطمہ ثریا بجیا	یکم ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۰ر فروری ۲۰۱۶ء
سید عبدالعظیم	یکم ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۱ر جنوری ۲۰۱۶ء
منشا یاد	۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء	۱۵ر اکتوبر ۲۰۱۱ء
جوگیندر پال	۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء	۲۳ر اپریل ۲۰۱۶ء
آل احمد سرور	۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء	۹ر فروری ۲۰۰۲ء
صابر دت	۹ر ستمبر ۱۹۳۸ء	۳ر فروری ۱۹۹۹ء
رضوان احمد	۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء	یکم جون ۲۰۱۱ء
ثمینہ راجہ	۱۱ر ستمبر ۱۹۶۱ء	۳۰ر اکتوبر ۲۰۱۲ء

ممتاز مفتی	۱۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء	۳ر نومبر ۱۹۹۵ء
رئیس امروہوی	۱۲ر ستمبر ۱۹۱۴ء	۲۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء
ممتاز شیریں	۱۲ر ستمبر ۱۹۲۴ء	۱۱ر مارچ ۱۹۷۳ء
فانی بدایونی	۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ء	۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء
کلیم الدین احمد	۱۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۲ر دسمبر ۱۹۸۳ء
شان الحق حقی	۱۵ر ستمبر ۱۹۱۷ء	۱۱ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
رام لال نابھوی	۱۶ر ستمبر ۱۹۱۸ء	۱۶ر مارچ ۱۹۹۵ء
عطا کاکوروی	۱۷ر ستمبر ۱۹۰۴ء	۲۳ر فروری ۲۰۱۶ء
نوح ناروی	۱۸ر ستمبر ۱۸۷۸ء	۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء
یوسف حسین خاں	۱۸ر ستمبر ۱۹۰۲ء	۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء

خمار بارہ بنکوی	۱۹ر ستمبر ۱۹۱۹ء	۱۹ر فروری ۱۹۹۹ء
عرش ملسیانی	۲۰ر ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۵ر ستمبر ۱۹۷۹ء
مانک ٹالہ	۲۱ر ستمبر ۱۹۲۴ء	۱۹ر فروری ۲۰۱۳ء
محمد حسنین بیکل	۲۳ر ستمبر ۱۹۲۳ء	۱۷ر فروری ۲۰۱۶ء
منظر کاظمی	۲۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء	۱۲ر اگست ۲۰۰۰ء
برج پریمی	۲۴ر ستمبر ۱۹۳۸ء	۳۰ر اپریل ۱۹۹۰ء
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۴ر ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء
اطہر پرویز	۲۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء	۱۰ر مارچ ۱۹۸۴ء
بلراج کومل	۲۵ر ستمبر ۱۹۲۸ء	۲۴ر نومبر ۲۰۱۳ء
رام بابو سکسینہ	۲۷ر ستمبر ۱۸۹۶ء	۲۰ر دسمبر ۱۹۵۷ء
پرویز شاہدی	۳۰ر ستمبر ۱۹۱۰ء	۵ر مئی ۱۹۶۸ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۶

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

ستمبر ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 115

Email:
nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِسالانہ : ایک سو دس روپے
فی شمارہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

خصوصی گوشہ

لکھنؤ آ کر اردو سے اور قریب ہو گئے گورنر ..... سہیل وحید ۳
سوئے ٹوپی والے کا سبق ..... گورنر رام نائیک ۷
اردو دوست گورنر جناب رام نائیک ..... وقار رضوی ۹

مضامین

مغل دور میں فن صحافت کا ارتقاء ..... نیلوفر حفیظ ۲۰
سوشل میڈیا کے مثبت ومنفی پہلو ..... عبیداللہ ناصر ۲۵
الکٹرانک میڈیا؛ صحافت کی بدلتی تصویر ..... عرفان علی ۳۰

افسانے

بند لفاف ..... جابر حسین ۳۲
کوکھ کی تلاش ..... ترنم جہاں شبنم ۳۵
کہانی ایک مصور کی ..... عبیداللہ چودھری ۳۷

گزشتہ لکھنؤ

فرنگی محل اور ندوۃ العلماء ..... مرزا جعفر حسین ۳۹

ہندی کہانی

سرنگ ..... جواہر چودھری ۴۲

ہندوستانی زبانیں

ایندھن (پانچویں قسط) ..... حمید دلوائی ۴۶

غیر ملکی ادب

بسمل ..... پروفیسر عبدالخالق رشید ۴۸

غزلیں ونظمیں

رئیس الشاکری ۱۳
جاوید اکرم، ڈاکٹر خالد عبادی ۱۵
شریف قریشی، ممتاز نازاں ۱۷
سید سلمان عابدی، شاہین افشاں ۱۹
اشتیاق احمد ضیاء، ملک زادہ جاوید ۱۴
رفیع سرسوی، مشتاق جاوید ۱۶
ثروت جمال، ڈاکٹر عادل حیات ۱۸

مزاحیہ

شامت اعمال ..... فضل حسنین ۵۲

نقد وتبصرہ

آج کل ڈائمنڈ جبلی نمبر ..... شاہد کمال ۵۴
برمحل اشعار اور ان کے مآخذ ..... زیبا پروین ۵۵

تاثرات

آپ کے خطوط ۵۶

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا اس سے متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کی سماجی سرگرمیوں سے بھلا کون واقف نہیں ہے لیکن وہ اردو کے زبردست مداح ہیں، اردو سے انہیں محبت ہے اور وہ اردو کے فروغ اور ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں، یہ بات شاید بہت لوگوں کو نہیں پتہ ہے۔ گزشتہ دنوں ادارۂ 'نیادور' کے اصرار پر انہوں نے ہمیں گفتگو کے لئے مدعو کیا اور اتر پردیش میں اردو کی ترقی، زبان و ادب کی بقا کے لئے کئے جارہے کاموں نیز راج بھون میں اردو سے متعلق سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ دوران گفتگو ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اردو کا جادو کسی پر بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کوئی ذرا بھی اردو سے رابطہ میں آیا، وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ہے۔ اپنی انہیں خصوصیات کی بنا پر اردو پورے دنیا میں نئے نئے گوشے تلاشتی رہی ہے۔

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کی پوری سیاسی زندگی ممبئی اور دہلی میں گزری، ظاہر ہے کہ بھانت بھانت کے لوگوں سے ان کا سابقہ پڑا ہوگا، لیکن اردو سے ربط ضبط کے بعد ان کے اندر اس زبان کے تئیں ایک نرم گوشہ پیدا ہوا۔ اتر پردیش کے گورنر بننے کے بعد ان کا تجربہ ہے کہ لکھنؤ میں قدم قدم پر اردو نظر آتی ہے، خاص و عام کے عام معمولات میں اردو رچی بسی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش میں جب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے تو اسے وہ مرتبہ بھی ملنا چاہئے جس کی وہ حقدار ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے راج بھون میں اردو کے تمام پروگرام منعقد کرائے اور اپنی کتاب 'چریویتی! چریویتی!' کا اردو ایڈیشن بھی شائع کرایا۔ یہی نہیں راج بھون کی اپنی اس سال کی رپورٹ کو بھی انہوں نے اردو میں شائع کرایا۔ ادارہ 'نیادور' ان کی اس اردو دوستی کا خیر مقدم کرتا ہے اور اسی بنا پر ہم ان سے متعلق ایک مضمون اور ان سے ہوئی گفتگو کے اقتباس شائع کر رہے ہیں۔

ادارۂ 'نیادور' کے اصرار پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر جابر حسین نے ہمیں اس شمارے کے لئے بطور خاص ایک کہانی ارسال کی ہے۔ جابر صاحب سالہا سال بہار کی سیاست میں سرگرم رہے ہیں۔ بہار لیجسلیٹو کاؤنسل کے چیئرمین بھی رہے ہیں۔ دو درجن سے زائد کتابوں سے مصنف پروفیسر جابر حسین افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت شاعر اور کالم نگار بھی ہیں۔

ہم نے کوشش تو شروع سے کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکے کہ ہر مہینے ایک مزاحیہ ضرور شائع کریں، کئی لوگوں سے گزارش کی لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ اس مرتبہ ہم فضل حسنین صاحب کا ایک مزاحیہ شامل کر رہے ہیں اور امید کر رہے ہیں کہ مزاح نگار 'نیادور' کے لئے اپنی تخلیقات ارسال کرتے رہیں گے۔ اس شمارے میں سوشل میڈیا اور لکٹرانک میڈیا پر جو دو مضامین پیش کئے جارہے ہیں وہ خاص طور پر 'نیادور' کے اصرار پر لکھے گئے ہیں۔ سوشل میڈیا کے اثرات کے ساتھ ساتھ اس کے تکنیکی اور ادبی پہلو پر بھی ہم نے ماہرین کے مضامین پیش کئے ہیں۔ لیکن ہمیں پتہ ہے کہ دو مضامین اس موضوع کا حق ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ سوشل میڈیا ہماری زندگی کا لازمی جز بن چکا ہے۔ خوش آئند یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ادب کی رسائی بھی آسان ہوئی ہے۔ سہل ممتنع اور ضرب المثل والے سیکڑوں ہزاروں اشعار نے سوشل میڈیا میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

'نیادور' کے لئے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے نئے رنگ و آہنگ کی چہار جانب تعریف و توصیف ہو رہی ہے۔ ہمیں جنوبی ہندوستان سے لے کر جموں و کشمیر تک کے اردو قارئین کے فون، واٹس اپ اور ای میل آرہے ہیں جن میں اکثر و بیشتر لوگ یہ کہہ رہے ہیں 'نیادور' پابندی سے ہر ماہ شائع ہونے لگا اور اس کے مشمولات کی ہمہ جہتی قابل ذکر ہے۔ ہمیں بیحد خوشی ہے کہ ادارۂ 'نیادور' کی محنت رنگ لا رہی ہے اور خاص طور پر اردو کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی 'نیادور' میں شمولیت کا خیر مقدم کیا جارہا ہے۔ 'نیادور' کے گزشتہ چار شماروں میں ہم نے درجن بھر سے زائد نئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا ہے۔ غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کو ترجیح دیتے ہوئے ان کی تخلیقات کو خصوصی طور پر شائع کیا ہے۔ ہم یہ سلسلہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو کی نوجوان نسل کا 'نیادور' کے ساتھ رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا جائے۔ ہم یہ بھی کوشش کریں گے کہ جلد ہی ہم ایک پورا شمارہ نوجوان افسانہ نگاروں اور دوسرا شمارہ نوجوان شعراء کی تخلیقات سے مزین کریں۔ اردو کے نئے گوشے تلاش کئے جائیں اور اردو داں طبقہ میں 'نیادور' کی مقبولیت کے لئے ایسی تخلیقات شائع کی جائیں جو عوام الناس کے مزاج سے زیادہ مماثلت رکھتی ہوں۔

> ہندوستان کے شمال مشرق کی سات ریاستوں کو 'ہفت عجائب' کہا جاتا ہے۔ وہاں کی طرزِ زندگی، زبان، تہذیب و تمدن اور سماجیات کے بارے میں واقفیت ہم لوگوں کو ذرا کم ہے۔
>
> ادارہ 'نیادور' فخریہ طور پر یہ اعلان کر رہا ہے کہ انہیں ریاستوں میں سے ایک 'شیلانگ' میں رہنے والے ایک قبیلے کی 'کھاسی' زبان کی کہانیوں کو جلد شائع کرے گا۔ ان نمائندہ 'کھاسی' کہانیوں کا اردو ترجمہ معروف افسانہ نگار **ف۔س۔اعجاز** نے کیا ہے۔

مقبول و معروف افسانہ نگار اور محقق پروفیسر نیر مسعود کا گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا۔ 'نیادور' کے اگست کے شمارے میں ہم نے ان سے ہوئی گفتگو کے اقتباس بطور خراج عقیدت شائع کئے تھے لیکن ان کو بطور خراج یہ ان کی شایان شان نہیں تھا۔ ہم جلد ہی نیر مسعود صاحب پر ایک پورا شمارہ شائع کریں گے جس میں ان کی تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں کے علاوہ ان کی کہانیوں کے مختلف زبانوں میں ہونے والے تراجم بھی شائع کریں گے۔

اگست کے شمارے میں شائع ہونے والی تمام تخلیقی نگارشات کے تخلیق کاروں کے قلمی تعاون کے لئے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ماہنامہ 'نیادور' کے اس جدید رنگ و آہنگ کو ایک سمت و رفتار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معاصر تخلیق کار اس ادبی مسافت میں ہماری استعانت کرتے رہیں گے۔

ہم جلد ہی 'نیا دور' کو عالمی سطح پر نیا دور کی نئی شناخت قائم کرنے اور اس کے ای ایڈیشن کو بھی شروع کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ دوسرے ممالک میں موجود زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں تک ہم رسائی حاصل کر سکیں۔

سہیل وحید

گورنر جناب رام نائیک لکھنؤ آکر اردو سے اور قریب ہو گئے

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔مختلف سماجی معاملات میں انہوں نے اپنی فعالیت کا ثبوت دیا ہے۔اردو سے ان کی محبت اور قدردانی کے قصے چہار جانب موضوع گفتگو رہے ہیں۔ادارہ ’نیا دور‘ کے اصرار پر انہوں نے اپنے روزانہ کے معمولات میں سے ہمارے لئے کچھ وقت نکالا اور ہمیں گفتگو کا موقع دیا جس کے اقتباسات پیش ہیں۔ایڈیٹر

آپ کی مقبولیت اتر پردیش کے اردو داں طبقہ میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔اردو کے لئے آپ کی خدمات کو سراہا جانے لگا ہے جب کہ آپ کی مادری زبان مراٹھی ہے۔ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ اردو سے کیسے وابستہ ہو گئے؟

میں اردو کا جانکار نہیں ہوں، زیادہ بول بھی نہیں سکتا، دس جملے بھی اردو کے نہیں بول سکتا لیکن اردو ہندوستانی آئین کے تحت قومی زبان ہے اور میری نظر میں سبھی قومی زبانوں کا احترام کیا جانا چاہئے۔ اس لئے اردو کی بھی عزت افزائی ضروری ہے۔

آپ اردو سے اس حد تک کیسے وابستہ ہو گئے، کیسے ہو گئی اردو سے اتنی قربت؟

دیکھے، ہماری زندگی سماجی اور سیاسی رہی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ممبئی جیسے شہر میں مجھے اپنی زندگی کی شروعات کرنے کا موقع ملا۔ میں متوسط طبقہ کے خاندان میں پیدا ہوا۔والد صاحب بھی سماجی کاموں میں دلچسپی رکھتے تھے، شاید اسی لئے پہلے جن سنگھ اور پھر بعد میں بی جے پی کا فعال کارکن بنا۔ ۱۹۷۸ء میں میں نے مہاراشٹر اسمبلی کے انتخابات میں امیدوار ہوا اور کامیابی حاصل کی۔ میں تین مرتبہ ایم ایل اے رہا۔ اس کے بعد پانچ مرتبہ لوک سبھا کا ممبر رہا۔ اس دوران لوگوں کے درمیان آنا جانا ہوتا تھا۔ ہر طرح کے لوگوں سے ملتا تھا تو اردو بولنے والوں سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔ اس دوران یہی سیکھ ملی کہ ہندوستانی آئین نے اردو کو جو درجہ دے رکھا ہے اس کے اعتبار سے اس کی عزت افزائی ہونی چاہئے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کا احترام کر رہا ہوں۔

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک ینگون میں واقع آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی مزار پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے (۱۶/اگست ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے گورنر بننے کے بعد اردو سے آپ کی مزید وابستگی بڑھ گئی؟

عام لوگوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ان میں اردو داں طبقہ بھی ہے۔سبھی زبانوں کے لوگوں سے میرا ملنا جلنا اور سبھی سے تعلقات ہیں۔ اتر پردیش کا گورنر بننے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ اردو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان ہے تو مجھے لگا کہ میری بھی ذمہ داری ہے اسے فروغ دینے کی۔ گورنر کے ناطے اور اس کردار میں مجھے لوگوں سے مل کر احساس ہوا کہ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ان میں پڑھے لکھے بھی ہیں اور عام انسان بھی ہیں۔ اردو سب کے درمیان بولی جاتی ہے اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔ ہندی کی خاصیت یہ ہے کہ ملک بھر میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ پورے ملک کی سبھی ریاستوں میں اردو کا اگر نمبر لگایا جائے تو یہ نمبر دو پر آئے گی اور اس میں جو نزاکت ہے، شیرینی ہے اس سے ہمیں کبھی کبھی رشک آتا ہے جب اردو والے کئی کئی

شعر پڑھ دیتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہمیں بھی اس طرح کا کچھ آنا چاہئے۔

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود اسے جو مرتبہ ملنا چاہئے وہ شاید نہیں مل سکا۔ آپ اس کی کیا وجہ محسوس کرتے ہیں؟

اردو کی ان دیکھی اور اس کا استعمال سیاسی طور پر زیادہ ہوا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اردو کسی خاص طبقہ کی زبان ہے۔ یہاں آکر یہ بات اور بھی اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ یہاں پریم چند، فراق گورکھپوری، پنڈت برج نارائن چکبست، دیا شنکر نسیم، منشی نول کشور جیسے اردو کے عظیم شاعر اور مصنف لکھنؤ کی ہی دین ہیں۔ بعد کے دنوں کی بات کی جائے تو رام لعل، بشیشور پردیپ اور کرشن بہاری نور سے لے کر ابھی بھی کئی نام جیسے خوشبیر سنگھ شاد، سنجئے مصرا شوق، منیش شکلا، سیاسچدیو، پی پی شریواستو رند وغیرہ اس طرح کے کتنے نام ہیں جو ابھی بھی اردو کے معتبر شعراء میں شامل ہیں۔ جیسے پنجاب میں تقسیم سے قبل اردو کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوتا تھا لیکن ملک کی تقسیم کے بعد وہاں بھی اردو کا استعمال کم ہو گیا لیکن یہاں اردو والوں کے دل میں یہ بات ہے کہ اردو کے ساتھ حکومت کا رویہ مزید بہتر ہونا چاہئے۔ اردو کے لوگ ملاقات کے لئے آتے ہیں تو یہی بات سامنے آتی ہے۔

اتر پردیش میں اردو کی ترقی کے لئے آپ نے کئی کام کئے، بعض موقعوں پر اس کا اظہار بھی کیا گیا۔

ہاں! ہم نے جب محسوس کیا اور جو کرنا چاہئے وہ کیا۔ مثلاً یہاں راج بھون کے چودہ گیٹ ہیں۔ جب یہ طے ہوا کہ ان سبھی دروازوں پر بہترین سائن بورڈ لگنا چاہئے تو جو ڈزائن آئے، ان میں صرف ہندی اور انگریزی میں ہی لکھا ہوا تھا۔ ہم نے کہا کہ جب اردو اس ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے تو راج بھون کے دروازوں پر بھی اردو میں بھی لکھا ہونا چاہئے تو اب سبھی ۱۴ دروازوں پر جو بورڈ لگائے گئے ہیں، وہ ہندی، انگریزی اور اردو میں ہیں۔ جب یہ بورڈ لگے تو لوگوں نے بہت تعریف کی کہ ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ اردو داں طبقہ کے بھی بہت سے لوگوں سے ستائشی فون آئے۔

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک رنگون میں واقع آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی درگاہ پر (۶/اگست ۲۰۱۷ء)

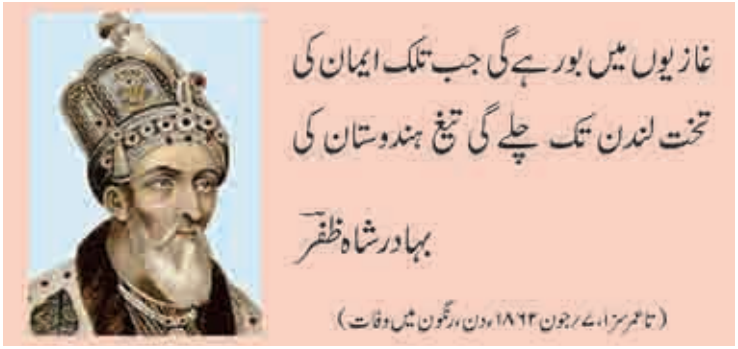

انڈمان نکوبار کی سیلولر جیل میں جناب رام نائیک نے بہادر شاہ ظفر کے اس شعر کا ہندی ترجمہ امرجیوتی کی ایک سمت نصب کرایا

آپ کی کتاب 'چرویتی! چرویتی!' کا بھی اردو ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

ایک واقعہ سنئے۔ میری زندگی کی یادیں اصلاً مراٹھی زبان میں ہیں۔ لیکن جب یہ مشہور ہوئیں تو ممبئی میں مراٹھی کے ساتھ گجراتی، ہندی اور انگریزی جو زبانیں چلن میں ہیں، ان زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونا چاہئے، ایسی تجویز آئی۔ ایک مصنف کے ناطے ہمیں یہ تجویز پسند آئی۔ اس تجویز کا مثبت جواب دیتے ہوئے ہم نے کہا کہ اردو میں بھی اس کا ترجمہ کریں تو ناشر نے قبول کرلیا۔ اس طرح سے یہ کتاب چار زبانوں میں شائع ہوئی۔ اس کی رسم اجراء اس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند جناب پرنب مکھرجی کے ہاتھوں ایسے پروگرام میں ہوا جس میں اس وقت کے نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب حامد انصاری، لوک سبھا اسپیکر محترمہ سمترا مہاجن، سابق وزیر اطلاعات و نشریات جناب وینکیا نائیڈو اور این سی پی کے صدر جناب شرد پوار بھی موجود تھے۔ اس پورے پروگرام میں موضوع گفتگو یہی رہا کہ اردو میں بھی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔

آپ کی سالانہ رپورٹ 'راج بھون میں رام نائیک' بھی تو اردو میں آئی ہے؟

۱۹۷۸ء میں پہلی مرتبہ میں مہاراشٹر اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا۔ اس کے بعد مسلسل تین مرتبہ ایم ایل اے رہا۔ اس کے بعد پانچ مرتبہ لوک سبھا کا ممبر منتخب ہوتا رہا۔ تو اس دوران عوام کے تئیں جوابدہی قائم رکھنے کی خاطر اور ان کے براہ راست رابطہ بنائے رکھنے

کے لئے ہر سال ایک رپورٹ شائع کراتا تھا۔ 'ودھان سبھا میں رام نائیک' اور پھر 'لوک سبھا میں رام نائیک' اس کے بعد ۲۰۱۴ء میں جب سے راج بھون آیا اس وقت سے ہر سال 'راج بھون میں رام نائیک' شائع کروا رہا ہوں۔ یہ پہلا موقع ہے جب ہندی کے ساتھ اردو میں بھی 'راج بھون میں رام نائیک' شائع ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے اب یہ بات لوگ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ہم اردو کے معاملے میں محض باتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اردو کے خیر خواہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ آنے کے بعد آپ کی اردو سے دلچسپی اور بڑھ گئی؟

ہاں، یہ کہا جاسکتا ہے لیکن اس کا سہرا اردو رائٹرس فورم کے سر جاتا ہے۔ ان لوگوں نے متعدد پروگرام منعقد کرائے۔ جو اس ادارہ کے صدر ہیں، وقار رضوی صاحب انہوں نے اپنے اخبار کا خصوصی گوشہ شائع کیا۔ اس کا اور کئی کتابوں کا اجراء کرایا تو اس سے اردو کے لوگوں سے ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور اس کے بعد سے اردو سے ایک جذباتی لگاؤ اور انس پیدا ہو گیا۔

راج بھون میں اس طرح کے ادبی اور ثقافتی پروگرام ہوتے آئے ہیں۔

یہاں راج بھون میں ہوتے آئے ہیں اور مسلسل ہو رہے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کو اور بڑھایا ہے۔ راج بھون میں کئی کتابوں کی رسم اجراء کے پروگرام ہوئے ہیں جن میں کئی اردو کتابوں کے پروگرام بھی شامل ہیں۔

اتر پردیش کے ادب و ثقافت کو فروغ دینے کی کوششوں میں بھی آپ کی خدمات لائق تحسین ہے۔

اتر پردیش کا ادب اور ثقافت ہر موقع اور ہر تہوار میں نظر آئے۔ ایک ماحول بنے اس طرح کا، اس کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھئے کہ 'یوم اتر پردیش' منانے کی کوشش بہرحال رنگ لائی اور حکومت نے ۲۴ جنوری کو 'یوم اتر پردیش' منانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اس کے لئے کئی بار حکومت کو لکھا، وزیر اعلیٰ سے کہا اور بالآخر یہ کام ہوا تو اسی طرح سے اور بھی کام ہیں جو ہم کرتے رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ وہ ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے چیئرمین اطہر نبی بھی اسی طرح ہم سے ملے۔ انہوں نے ہمیں مدعو کیا، وہاں پروگرام ہوئے اور اسی طرح لوگوں کے درمیان آمد و رفت بڑھی تو اس سے یہاں کے ادب اور ثقافت کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا۔

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک راج بھون میں اردو کے شاعر سہیل کاکوروی کی کتاب 'نیلا چاند' کا اجراء کرتے ہوئے (۴ مارچ ۲۰۱۷ء)

مہاراشٹر میں آپ کو اردو جاننے والے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا، وہاں اور یہاں کے اردو داں زبان و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مہاراشٹر میں اردو ہے لیکن یہاں جیسی اردو کی اہمیت ہے، ویسی وہاں نہیں ہے۔ ممبئی کے کچھ علاقے ہیں جہاں صرف اردو ہی بولی جاتی ہے لیکن ویسی نہیں جیسی یہاں لکھنؤ میں بولی جاتی ہے۔ یہاں لکھنؤ میں پورے سماج میں رچی بسی ہے۔ لیکن ممبئی در اصل ایسی جگہ ہے جہاں پوری دنیا کے لوگ مقیم ہیں۔ ہر ایک کی اپنی الگ شناخت ہے۔ کوئی نہ کوئی چھاپ ہر ایک پر چسپاں ہے۔ ویسا یہاں نہیں ہے۔ یہاں ہر کسی پر اردو کی چھاپ لمحہ لمحہ نظر آتی ہے چاہے کوئی بڑا آدمی ہو یا چھوٹا۔

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک راج بھون میں پروفیسر آصفہ زمانی کی کتاب 'آگہینہ' کا اجراء کرتے ہوئے (۲۵ اپریل ۲۰۱۵ء)

آپ ابھی حال ہی میں میانمار گئے تو وہاں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے مزار پر بھی حاضری دی۔ آپ وہاں اردو شاعر کی مزار پر گئے تھے یا ایک جنگ آزادی کے سورما کی مزار پر؟

دیکھئے، بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، جو ہماری پہلی جنگ آزادی تھی، اس کے مجاہد اعظم تھے۔ ہندوستان کے آخری بادشاہ تھے۔ وہ انگریزوں کے

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک راج بھون میں منعقد روزہ افطار کے پروگرام میں مہمانوں کے ساتھ (۲۳؍جون ۲۰۱۷ء)

خلاف اعلان جنگ کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ حالانکہ یہاں ہر چیز کو ہندو مسلم کی نظر سے دیکھنے کی عادت ہے لیکن ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے۔ انگریزوں نے انہیں وہاں جس حال میں بھیجا، جس حالت میں رنگون کی جیل میں قید رکھا۔ ان کی خدمات کو اور ملک کے لئے ان کی قربانی کو یاد رکھتے ہوئے ہم انہیں گلہائے عقیدت پیش کرنے گئے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ وہ اردو کے بہترین شاعر بھی تھے۔ اب وہاں منڈالا جیل نہیں ہے۔ ہم وہاں بھی جانا چاہتے تھے جہاں معروف مجاہد آزادی اور اپنے وقت کے بہترین صحافی لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ اب اس جیل کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ اسے دیکھنے کی خواہش تھی۔

آپ نے انڈمان نکوبار میں سیلولر جیل میں قید مجاہدین آزادی کی یاد میں امرجیوتی تعمیر کرائی تھی اور اس پر بہادر شاہ ظفر کا ایک قول تحریر کروایا تھا۔

ہاں، جب میں حکومت ہند میں وزیر پٹرولیم تھا تو رسوئی گیس کے انڈمان کے ہر سلنڈر پر آنے والے ۲۷۰؍روپئے کے ٹرانسپورٹ کے خرچ کو وہاں بائلنگ پلانٹ لگوا کر کم کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ پورے ملک میں سلنڈر ایک قیمت پر دستیاب ہو۔ اسی سلسلہ میں جب وہاں گیا تو ظاہر ہے کہ سب سے پہلے سیلولر جیل گیا۔ وہاں کوئی بھی جاتا ہے تو سب سے پہلے وہی جیل دیکھنے کے لئے جاتا ہے۔ اپنے مجاہدین آزادی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے۔ تو ہم نے وہاں پر جو قصیر القامت مینار تھا اس پر امرجیوتی بنوائی۔

اس کا ڈزائن اس طرح تیار کیا تھا کہ اس کے چاروں جانب اقوال لکھوائے گئے جن میں ایک جانب بھگت سنگھ، دوسری جانب ویر ساورکر اور بہادر شاہ ظفر، تیسری جانب سبھاش چندر بوس اور چوتھی طرف مدن لال ڈھینگرا کے اقوال تھے لیکن الیکشن آئے اور ضابطۂ اخلاق نافذ ہو جانے کے سبب ہم امرجیوتی کا افتتاح نہیں کر سکے۔ ہمارے بعد منی شنکر ایّر پٹرولیم منسٹر بن گئے، انہوں نے ویر ساورکر اور بہادر شاہ ظفر والی پلیٹ نکلوا کر مہاتما گاندھی کے نام کی پلیٹ لگوا دی۔ خیر، تو اس طرح جب ہمیں موقع ملتا ہے تو ہم کام کرتے ہیں۔

راج بھون میں روزہ افطار پارٹی کو بھی آپ نے جاری رکھا ہے۔

ہاں، ہم نے یہاں آکر دیکھا کہ جو اچھی روایات پہلے سے چلی آرہی ہیں، انہیں قائم رکھا جائے۔ جب ہم یہاں گورنر کی حیثیت سے آئے تھے تو ۲۲؍جولائی ۲۰۱۴ء تھی اور ۲۷؍جولائی کو روزہ افطار تھا جس کا دعوت نامہ پہلے ہی ارسال کیا جا چکا تھا۔ ہم نے اسے ہونے دیا اور اس میں شامل بھی ہوئے۔ یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔

❑❑❑

گورنر جناب رام نائیک کی تصنیف چریویتی! چریویتی! کے اقتباسات

سوئے ٹوپی والے کا سبق

۱۶/اپریل ۱۹۳۴ء کو میری پیدائش مہاراشٹر کی اوندھ ریاست جسے اب سانگلی ضلع کے نام سے جانا جاتا ہے، کے چھوٹے سے قحط زدہ گاؤں، آٹپاڑی میں ہوئی۔ میرے والد جو ماسٹر کلکرنی کے نام سے جانے جاتے تھے، وہاں کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

آج میں عمر کی ۲۱ویں دہلیز پر بطور گورنر اتر پردیش اپنی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس لمبے سفر کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے اپنا بچپن یاد نہ آیا ہو۔ کہیں بھی جاؤں، میری آٹپاڑی میرے ساتھ چلتی ہے، وہ کبھی بھی میرے کلیجے سے الگ نہیں ہوئی۔ وہ مجھے ماضی میں کھینچ لے جاتی ہے، بہت پیچھے، ۷۰۔۷۵/برس پیچھے اور میں ایک بچہ بن جاتا ہوں۔ ایک اسکولی بچہ۔۔۔۔۔!

راجا بالا صاحب پنت پرتیندھی، اوندھ ریاست کے سربراہ تھے۔ اوندھ ہمیشہ سے ہی قحط سے متاثر رہنے والی ریاست کہلاتی تھی۔ قحط کا شکار ہوتے ہوئے بھی یہ ریاست اپنے فن اور بیماریوں سے پاک ہونے کے لئے مشہور تھی۔ یادوں کی ڈالی کو ذرا سا بھی جھنجھوڑتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے بچپن کی لہریں تیرنے لگتی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ۸۱/برس تک میری صحت کیسے ٹھیک رہی؟ کینسر کو میں نے کیسے مات دی؟ سچ پوچھئے تو یہ ایک بڑا راز ہے۔ اس راز کا نام ہے 'سوریہ نمسکار' جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا بچپن اوندھ ریاست میں بیتا۔ اوندھ کا میوزیم بہت مشہور ہے۔ اس میں 'ماں، بیٹے' کا مجسمہ ہے جو بہت مشہور ہوا ہے۔

اوندھ ریاست کے سربراہ راجا بالا صاحب پنت پرتیندھی سوریہ نمسکار کے ایک طرح سے دیوانے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر ایک شخص سوریہ نمسکار سیکھے اور کرے۔

انہیں یقین ہو گیا تھا کہ صرف اور صرف سوریہ نمسکار ہی بہترین صحت پانے کا صحیح نسخہ ہے۔ اپنی

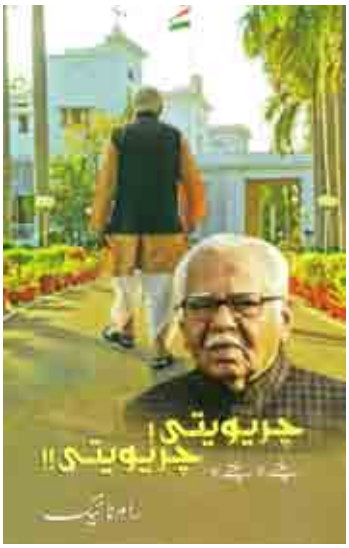

ریاست کی رعایا کی صحت کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے سوریہ نمسکار کی روایت ڈالی۔ اسکول کے ٹائم ٹیبل میں پہلا گھنٹہ سوریہ نمسکار کا ہی رکھا گیا تھا۔ میرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بہت سخت اور اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ جو بچہ سوریہ نمسکار نہیں کرتا، اسے وہ کلاس میں بیٹھنے نہیں دیتے۔ وہ سختی سے کہتے 'صحت ہی سچا گہنا ہے' اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میں ایسے گہنے گڑھنے والے ہیڈ ماسٹر کوئی اور نہیں، میرے والد ہی تھے۔

ہماری نسل بھلے ہی قحط سے متاثر گاؤں میں پیدا ہوئی مگر یہ سچ ہے کہ سوریہ نمسکار کرنے کے اصولوں کو اپنا کر ہم نے خود کو تندرست بنایا، بہترین صحت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ ۸۱/سال کی عمر میں بھی میں تندرست ہوں، اپنے روزمرہ کے کام بغیر کسی رکاوٹ کے کرتا ہوں۔ ان دنوں سوامی وویکانند جینتی کے سبب سوریہ نمسکار کی مہم چلتی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ ملک کے بچوں اور نوجوانوں کو سوریہ نمسکار کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ خیر

ناممکن کچھ بھی نہیں

مجھے یہ بتانا ضروری لگتا ہے کہ بچپن میں جیسے میں نے تندرستی پائی ویسے ہی کچھ اور بھی کمایا ہے۔ میں نے ایک لغت تیار کی، ایسی لغت جس میں ناممکن لفظ نہیں تھا۔ میں نے خود میں یہ یقین پیدا کیا کہ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ سخت محنت اور سچی لگن سے کوشش کرتے رہو تو ناممکن لفظ اپنے آپ غائب ہو جاتا ہے، لغت میں دکھتا ہی نہیں۔ محنتی اور کوشش کرنے والا ہونے کی وجہ سے میں اساتذہ کا چہیتا تھا، لیکن اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں تھی کہ میرے والد ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرے والد مجھے بیٹا نہیں بلکہ ایک طالب علم کے طور پر دیکھتے تھے۔

اوندھ کے راجا کو مصوری کا بڑا شوق تھا۔ وہ خود ایک عمدہ مصور تھے۔ انہوں نے اسکول میں مصوری کے مضمون کو لازمی کر دیا تھا۔ بیشک مصوری ایک بہترین مضمون ہے۔ برش، پنسل اور رنگوں کے سہارے انسان کو اندر سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ہاں تو مصوری کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ایک مصوری کے ماسٹر صاحب نے مجھے تاکید کر کے اس کے ابتدائی امتحان میں بٹھایا۔ امتحان کا مرکز آٹپاڑی سے ۳۰ کلومیٹر دور پنڈھرپور میں تھا۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ ایک ہونہار بچے کے طور پر میرا انتخاب کیا گیا تھا۔ میرا بھولا بھالا من پریشان ہو گیا۔ حالات ایسے تھے کہ من کو پریشانیوں نے گھیر لیا تھا کہ میموری ڈرائینگ کے امتحان میں ہونہار بچے والی شبیہ کہیں مٹی میں مل گئی تو؟ کلال ماسٹر ڈرائینگ کے ٹیچر تھے۔ وہ ہی مجھے پنڈھرپور لے آئے تھے۔ ان کو مجھ سے بہت امیدیں تھیں۔ امتحان کا پرچہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ 'بندر اور ٹوپی والا' کی تصویر بنانے کے لئے کہا گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ایک بڑا سا پیڑ بنایا، اس پر ٹوپی پہن کر ٹہنیوں پر بیٹھے بندروں کی تصویر بنائی۔ بس لگا کہ تصویر جھٹ پٹ پوری ہو جائے گی۔ تبھی ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ پیڑ کے نیچے سوئے ہوئے انسان کا چہرہ میں نہیں بنا پا رہا تھا، بہت کوششیں کی لیکن بات نہیں بنی۔ بار بار ربر سے تصویر مٹانے اور بنانے کی وجہ سے کاغذ پھٹنے کا ڈر تھا۔ میں پریشان سا بیٹھا رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کروں؟ امتحان کا وقت ختم ہو رہا تھا، من میں کئی خیال آ رہے تھے۔ ہے بھگوان! فیل ہو گیا تو کیا کروں گا؟ آبرو مٹی میں مل جائے گی، کلال ماسٹر کا بھروسہ مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔ پریشانی میں جھول رہا تھا کہ اچانک ایک ترکیب سوجھی ٹوپی والے کا چہرہ نکالنے کا خیال چھوڑ کر سیدھے سیدھے چادر سے چہرہ ڈھانپ کر سوئے ہوئے ٹوپی والے کی تصویر میں نے کاغذ پر بنائی اور یہ جتانے کے لئے کہ وہ ایک آدمی ہے، میں نے چادر سے باہر صرف اس کے نکلے ہوئے پیر دکھائے۔ کیا بتاؤں! خوش قسمتی سے میں پاس ہو گیا۔ وقت کے اشارے، سوجھ بوجھ اور سب کچھ ممکن ہونے کی سوچ نے اس وقت میرا بیڑا پار لگایا۔ اس ٹوپی والے کے واقعہ نے مجھے دو سبق سکھائے۔ ایک بغیر گھبرائے، پرسکون رہ کر سوچنے سے راہ مل جاتی ہے۔ دوسرے، قسمت ہر بار ساتھ دے گی ایسا نہیں ہے۔ ہمیں خود محنت سے کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

مجاہد آزادی ساورکر کی ترغیب

'دیش بھکتی کا یہ ورت ہم نے آنکھ موند کر نہیں لیا' آزادی کے مرد مجاہد ساورکر کی یہ زندہ جاوید نظم کی لائنیں جس پتھر پر کندہ کی گئی ہیں، اس آزادی کی مشعل کا انڈمان کے سیلیولر جیل میں ۴؍جولائی ۲۰۱۵ء کو دوبارہ 'بھومی پوجن' کرتے ہوئے مجھے لگا جیسے یہ زندگی سرشار ہو گئی۔ دل کی کسک کم ہوئی، کشمکش ختم ہوئی اور مانو دل کے زخم بھر رہے ہوں۔

جی ہاں، ہماری قومی آزادی کے مجاہد ساورکر کی نظم کی لائنوں سمیت ۲۴؍گھنٹے لگاتار سلگتی مشعل بنانے کی تجویز پہلے انڈمان میں طے ہوئی لیکن جب وہ حقیقت میں قائم ہوئی تو اس پر سے ان کی یہ نظم کی لائنیں مٹا دی گئیں۔ یہ خلش، یہ توہین گزشتہ ۱۱؍سال سے میرے من کو پریشان کر رہی تھی۔ یقیناً اس بھومی پوجن کے بعد اب کوئی وہ نظم کی لائنیں ہٹانے اور ہمارے بہادر سپاہی کی توہین کرنے کی ہمت نہیں جٹا پائے گا۔

سب سے پہلے میں انڈمان گیا تھا۔ گھریلو گیس سلنڈر کے باٹلنگ پلانٹ کا افتتاح کرنے کے لئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ملک کے دشوار گزار علاقوں میں گیس سلنڈر پہنچانا کتنا خرچیلا ہوتا ہے۔ اس علاقے کے لئے سرکار کو بھاری مالی امداد دینی پڑتی ہے، لوگوں کو بھی زیادہ پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس پریشانی کے حل کے طور پر میں جب پٹرولیم وزیر تھا تب دشوار گزار علاقوں میں باٹلنگ پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا۔ ملک کے شمالی سرے پر سمندر میں واقع اس جزیرے پر سلنڈر لے جانا واقعی ناممکن تھا لہٰذا وہاں باٹلنگ پلانٹ کا میں نے ۲۰؍اپریل ۲۰۰۳ء کو افتتاح کیا۔

انڈمان؛ میری زیارت گاہ

جب میں پہلی مرتبہ انڈمان گیا تب اس سیلیولر جیل کے دیدار کا خواہاں تھا جہاں ساورکر کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ میرے ساتھ ممبئی اور دہلی کے کچھ صحافی بھی تھے۔ وزیر رہتے ہوئے انڈمان صرف ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں اپنے کنبہ کے ساتھ گیا۔ خیال یہی تھا کہ جس جگہ ہمارے قابل پرستش مرد مجاہد نے ۱۱؍سال بامشقت جیل میں مشکلات جھیلیں اس پاک مقام کو سب ساتھ میں دیکھیں اور دھیان کریں۔ ساورکر کو کونے کی جس کوٹھری میں تنہائی میں رکھا گیا تھا، ہم نے وہاں اپنی جبین خم کر دی۔ میں بہت جذباتی نہیں ہوں لیکن مجھے وہاں ساورکر کی زندہ جاوید مراٹھی نظم 'نے مجسی نے پرت ماتر بھوملا' (اے سمندر! مجھے میرے وطن لے چلو) سننے کا دل چاہا۔ سروں کی ملکہ لتا منگیشکر کی آواز میں اس گیت کی کیسٹ میں ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے سب سے وہاں رکنے کی گزارش کی۔ وہاں اتنی تپش تھی کہ گانا سنتے سنتے صرف ۴۔۵ منٹ ہی میں ہم لوگ پسینے سے شرابور ہو گئے۔ اس کوٹھری میں اوپر کی طرف ایک چھوٹی جھروکہ نما کھڑکی تھی۔ وہی کھڑکی جہاں کبھی کبھار چڑیا آ کر بیٹھتی تھی اور جس سے ساورکر باتیں کیا کرتے تھے۔ بیحد گرمی کی وجہ سے ایک دو لوگ غصے میں بدبدائے۔ 'چلو چلو، کتنی دیر رکیں گے، گرمی میں مرنا ہے کیا؟' وہ چلتے بنے، میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میں اتنا ہی کہہ پایا 'ساورکر نے اسی جہنم میں ۱۱؍سال گزارے، ہمیں اس طرح بولنے کی آزادی دلانے کے لئے۔' بھاری من سے ہم نے وہ جیل دیکھی۔ آزادی کے لئے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے والے سبھی آزادی کے سپاہیوں کی کہانی سن کر رونگٹے کھڑے ہو گئے، ہم ایک دم سرنگوں ہو گئے۔ ہر ایک کی قربانی، ان کی کہانی ایسی تھی کہ میں ہی نہیں پورا ملک انہیں سلام کرتا ہے۔ میں نے من ہی من طے کیا کہ مجاہدوں کی قربانی کی کہانی یاد دلانے والی عظیم الشان یادگار یہاں بھی بنانی ہوگی۔

❑❑❑

اردو دوست گورنر جناب رام نائیک

وقار رضوی
ایڈیٹر روزنامہ 'اودھ نامہ'، نرہی، لکھنؤ
موبائل: 9415018288

۲۲ر جولائی کو اتر پردیش کے گورنر عزت مآب جناب رام نائیک نے اودھ کی روح، گنگا جمنی تہذیب کی علامت کے شہر لکھنؤ میں اپنے قیام کے تین سال پورے کر لئے، وہ پہلے گورنر ہیں جو یہاں کے دانشوروں، ادباء، شعراء اور عوام کے دلوں تک پہنچے۔ جناب رام نائیک نے سیاسی نظریات سے بلند ہوکر گورنر کے فرائض انجام دیئے، ہر ایک سے بلا تکلف ملے اور ہر چھوٹی بڑی جگہ خوش مزاجی کے ساتھ تشریف لے گئے وہ اکثر پروٹوکال کو نظر انداز کر کے لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے جیسے وہ اُن ہی کی ایک فرد ہوں۔ جناب رام نائیک پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اُردو اس ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے اس کے بعد بھی اُسے وہ مرتبہ نہیں حاصل ہے جو ہونا چاہئے تھا۔ انہوں نے راج بھون کے گیٹ پر اُردو لکھنے کی ہی ہدایت نہیں دی بلکہ راج بھون میں ہر جگہ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی لکھے جانے کی ہدایت دی، یہی نہیں راج بھون میں استعمال ہونے والی اسٹیشنری، لفافے، بیگ اور دیگر کاغذات پر بھی اُردو میں راج بھون تحریر کرایا۔ جناب رام نائیک سے پہلے کئی اُردو کے شیدائی گورنر آئے لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو جناب رام نائیک نے تین سال کے وقفے میں کر دکھایا۔ یہ ان کے لئے خواہ کتنی ہی چھوٹی بات ہو لیکن اُردو والوں کے لئے یہ اس لئے بہت اہم ہے کہ انہوں نے اُردو زبان کے حق کا اعتراف کیا اور اس کی اہمیت کو سمجھا۔ انہوں نے اپنی کتاب 'چیریوتی چیریوتی' اُردو میں بھی شائع کرائی۔ جناب رام نائیک اگر اس بات کو شدت سے نہ محسوس کرتے کہ وہ اُتر پردیش کے گورنر ہیں اور یہاں کی دوسری سرکاری زبان اُردو ہے اس لئے اُن کی کتاب اُردو میں بھی شائع ہونا چاہئے تو کوئی اُن سے مطالبہ نہ کرتا کیونکہ اس سے قبل کسی نے بھی ایسا نہیں کیا کہ صوبہ کی دوسری زبان اُردو میں بھی ان کی کتاب کا ترجمہ ہو یہ احساس اُن کے اندر کی اُس بڑائی کو ظاہر کرتا ہے جو گورنر کی کرسی سے بڑی ہے اور جس کے لئے صرف ایک لفظ انسان ہے۔ غالبؔ نے اس کی شکایت کی تھی کہ

'آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'

وہ سانگلی کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں اٹپارٹی کے ایک ٹیچر کے گھر میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت، لگن اور سچی انسان دوستی سے لکھنؤ کے راج بھون تک پہنچے۔ ایک ایسے پیشے (سیاست) سے وابستہ ہونے کے باوجود جہاں انسانیت سے بڑی پارٹی ہوتی ہے وہاں جناب رام نائیک نے کبھی انسانیت اور انسان دوستی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جب وہ پاور منسٹر ہوئے تو ایسے لوگوں تک بجلی پہونچانے میں مصروف رہے جہاں تک بجلی کے کھمبے لگنا ممکن نہیں تھا، لیکن اس ناممکن کو بھی ممکن کر دکھایا وہ صرف اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ ہر گھر میں اُجالا ہو جائے جب وہ پیٹرولیم وزیر ہوئے تو اس جگہ تک گیس سپلائی لے گئے جہاں تک کبھی گیس نہیں گئی تھی اور جب انہیں محکمہ ریل کی وزارت ملی تو ریل کی تمام سہولیات میں اضافہ کرنے کے ساتھ سفر کرنے والی عورتوں کی

لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کی دو کتابوں کا رسم اجراء کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک

تکلیفوں پر خصوصی توجہ دی اور بہت حد تک ان کے تمام مسائل حل بھی کردیئے۔ وہ جذام (کوڑھ) کے مریضوں کے ایسے دوست بن گئے کہ وہ مہاراشٹر سے لکھنؤ اپنے ہردلعزیز جناب رام نائیک سے ملنے آئے۔ جناب رام نائیک نے ان کے لئے تمام سرکاری سہولیات فراہم کرائیں اور اس موذی مرض کے روک تھام کے لئے مسلسل کوششیں کرتے رہے جو آج تک جاری ہیں۔ اپنی محبت اور دوستی کی وجہ سے وہ مچھلی بستی کے سب سے مقبول اور چہیتے ساتھی بن گئے، ان کی یہی خوبی ہے اگر یہ رشتے صرف سیاسی مفادات کے لئے ہوتے تو اس علاقے سے تعلق ختم ہونے کے بعد یہ رشتے بھی ختم ہوجاتے لیکن یہ تعلق انسانیت اور محبت کا تعلق تھا جو ایک بار بننے کے بعد ختم نہیں ہوتا۔

عالمی اردو کانفرنس میں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک

یہ تذکرہ اس لئے ضروری تھا کہ عام شخص یہ جان سکے کہ انہوں نے اپنے سیاسی سفر میں کبھی سیاسی یا مذہبی اختلاف کو دخل نہیں دینے دیا، جو کیا وہ سب کے لئے تھا اگر ریل محکمہ کے وزیر رہتے خواتین کو سہولیات فراہم کرائیں تو وہ سبھی مذاہب کے خواتین کے لئے تھیں، جب گھر گھر گیس کنکشن پہونچائے تو وہ گھر سب کے تھے، جب گاؤں گاؤں بجلی پہنچائی تو سب کے گھر روشن ہوئے۔

ایسے ہی جب اتر پردیش کے گورنر بن کر آئے تو انہوں نے کسی بھی زبان میں امتیازی سلوک نہیں کیا سبھی زبانوں کو برابر احترام دیا جب انہیں معلوم ہوا کہ اُردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے اور اُسے وہ حق نہیں ملا جس کی وہ مستحق تھی تو بجائے اس کے کہ وہ بھی اوروں کی طرح صرف بیان بازی کرتے، انہوں نے ایسا نہ کرکے اُردو کو اس کا حق دلانے کی شروعات اپنے ہی گھر سے کردی، نہ صرف اُردو کو راج بھون میں دوسری سرکاری زبان ہونے کا حق دلایا بلکہ اُردو والوں کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمیں نہیں لگتا انہوں نے کسی بھی اُردو پروگرام میں جانے سے کبھی گریز کیا ہو، گریز تو کیا اُردو والوں کو ہمیشہ ترجیح دی، جس کا ثبوت ہے کہ وہ بہت ہی شارٹ نوٹس پر دن بھر کی مصروفیت کے باوجود اُردو والوں کا دل رکھنے کے لئے ایک چھوٹے سے ہال میں ایک کتاب کی رسم اجراء میں چلے گئے، اس کے علاوہ جب جب اُردو والوں نے انہیں اپنے کسی بھی پروگرام میں دعوت دی انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی تمام مصروفیت کے باوجود اس پروگرام میں صرف رسماً شرکت نہیں کی بلکہ پوری دلچسپی لی اور موضوع کے مطابق گفتگو کی، اُردو کے فروغ کے لئے گفتگو کی، اُردو والوں کو دعوت دی کہ آپ اپنی پریشانیاں ہمیں لکھ کر دیں ہم آپ کی مدد کی

ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ پر دو کتابوں کی رونمائی کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک

ہر ممکن کوشش کریں گے، اور کیا بھی ایسا ہی، ان سے مل کر اُردو والوں کو ہمیشہ مسرت کا احساس ہوا۔ اپنی اس اُردو دوستی سے وہ اُردو والوں کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے کہ اب تو اُردو والوں کا کوئی بھی پروگرام ان کے بغیر ادھورا لگتا ہے۔ وہ شاید پہلے گورنر ہیں جنہوں نے لکھنؤ میں انٹرنیشنل اُردو کانفرنس کی صدارت کی، وہ پہلے گورنر ہیں جنہوں نے پہلا ڈاکٹر شمیم نکہت اُردو فکشن ایوارڈ عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار اقبال مجید، ایس ایم اشرف اور ڈاکٹر ترنم ریاض کو دے کر اس کی بنیاد رکھی، انہوں نے اتنی اُردو کتابوں کا رسم اجراء کیا جتنی اُردو کتابوں کی رسم اجراء کسی ایک اُردو والے نے نہ انجام دی ہوگی۔

'چرویتی چرویتی' پر شائع ہونے والے اودھ نامہ کے خصوصی ضمیمہ کی رونمائی کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک

جناب رام نائیک اُردو رائٹرس فورم سے اپنے ابتدائی دنوں سے ہی قریب رہے ہیں، اس فورم کے ہر چھوٹے بڑے پروگرام میں انہوں نے اپنا بیش قیمت وقت اُردو ادباء، شعراء اور دانشوروں کو دیا۔ اسی لئے شاید تمام اُردو ادباء اور شعراء نے اپنی طرف اُن کے ایک قدم کے جواب میں دو قدم بڑھا کر ان کا استقبال کیا اور خود ان کی کتاب کی بیحد پذیرائی کی۔ کتابیں تو روزانہ شائع ہوتی ہیں اور ہر زبان میں شائع ہوتی ہیں لیکن جناب رام نائیک کی کتاب کی دو خصوصیات نایاب ہیں، پہلی یہ کہ یہ پہلی کتاب راج بھون لکھنؤ میں مراٹھی میں تصنیف کی گئی اور اس کے بعد دیگر دوسری زبانوں کے ساتھ اُردو میں بھی شائع ہوئی۔ دوسرے یہ بظاہر ایک شخص کی داستانِ سفر اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہے لیکن اگر اسے ذرا توجہ سے پڑھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ زندگی میں آگے بڑھنے، مشکلات اور ناکامیوں سے ہراساں نہ ہونے، مشکلات پر قابو پانے، زندگی کے سفر میں چلتے رہنے اور فتح و کامیابی تک پہنچنے کا گرو منتر ہے۔ یوں تو صوبہ میں گورنر کا آنا جانا ایک تاریخ کا حصہ ہے اس راج بھون میں کتنے گورنر آئے اور چلے گئے اور آئیں گے اور چلے جائیں گے، ان کے آنے جانے سے نہ عام آدمی کی زندگی پر اور نہ پڑھے لکھے طبقے کی زندگی پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ شاید ان کے نام بھی لوگوں کا یاد نہ ہوں کہ کب کون آیا کون گیا، لیکن جناب رام نائیک نے ادباء، شعراء اور دانشوروں کے حلقے میں راج بھون میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا جو آپ کی پرکشش شخصیت اور آپ کے بے تکلف اور بے تصنع برتاؤ کا نتیجہ ہے۔

اردو رائٹرس فورم کی جانب سے شمن زہرا رضوی نے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کو سپاس نامہ پیش کیا

ملک کی آزادی کے ساتھ اردو زبان کے ساتھ جو برتاؤ اور ناانصافی ہوئی اس سے ہر حکومت واقف رہی ہے، رام نائیک جی پہلے گورنر ہیں جنہوں نے نہ صرف راج بھون میں ہندی کے ساتھ اُردو کو رائج کیا بلکہ راج بھون کے اسٹاف کیلئے اُردو جاننے پر زور دیا اور خود بھی اُردو سیکھنے کے لئے کوشاں ہیں، جو ان کے سیاست اور مذہب سے بلند ہوکر زبان اور تہذیب سے لگاؤ کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ جناب رام نائیک کی اُردو دوستی سے متاثر ہوکر اُردو رائٹرس فورم نے چاہا کہ جناب رام نائیک کی اُردو ترجمہ ہوئی کتاب ''چیر یویتی چیر یویتی'' پر ایک مذاکرہ بڑے پیمانے پر کیا جائے جس میں تمام اُردو کے دانشور، ادیب اور شعراء موجود ہوں۔ انہوں نے نہ صرف اس کی فوراً منظوری دی بلکہ طے وقت سے

بہت زیادہ وقت بھی دیا، اُردو دانشوروں اور ادباء نے تفصیل سے ان کی کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا کسی نے کہا کہ جناب رام نائیک کی کتاب ان کی زندگی کے گذرے ہوئے وقت کی وہ داستان ہے جس میں زندگی کا پیغام ہے یہ ان کی ۸۴ سے زیادہ برسوں کی کارکردگی اور عوام کی خدمت گذاری میں صرف ہونے والی زندگی کی داستان ہے۔ تو کسی نے کہا کہ دنیا میں تجربات حوادث کی شکل میں جو انھیں ملا تھا اس کا بیان ہے یہ شعر جناب رام نائیک کی پوری زندگی کی ترجمانی کرتا ہے کیونکہ ۸۴ پڑاؤ تک کی سماجی اور سیاسی زندگی کے سفر کو انہوں نے دنیا کے سامنے بڑی خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ خود پر گذرنے والی کیفیت ''چلتے رہو چلتے رہو'' پڑھنے کے دوران سماجی سروکار پر غور کرتے ہوئے جناب رام نائیک کے نظریات اور زندگی میں جو زیادہ بیش قیمتی چیز نظر آئی وہ ان کا خدمت کا جذبہ ہے ان میں ایک خاص بات اور ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں اپنی والدہ اپنی بیوی محترمہ کندہ نائیک یا بیٹیاں ڈاکٹر نشی گندھا یا وشاکھا سب کی مدد اور تعاون کا اعتراف شکرگزاری کے ساتھ کیا جو بڑی بات ہے۔

بات میں نے شروع کی تھی رام نائیک جی کے لکھنؤ میں تین برس قیام کی ان کا قیام تو ابھی ہے۔ یہاں پر بار بار اردو کے حوالے سے ان کا ذکر آیا میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس نے ہم سب کو چونکایا۔ رام نائیک جی نے اپنے تین سال کے قیام کے دوران اپنے تیسرے سال کے کاموں پر روشنی ڈالنے کے لئے ۲۲؍اگست ۲۰۱۷ء کو (اپنے تین سال پورے ہونے کے دن) ایک پریس کانفرنس کی جس میں انھوں نے اپنی تین سال کی رپورٹ کی چھپی ہوئی کتاب کا اجرا کیا اور پریس والوں کو تقسیم کی۔ آزادی کے ۶۹ سال کی تاریخ میں پہلی بار راج بھون کی طرف سے ہندی کے ساتھ اردو میں بھی یہ رپورٹ چھپی اور وہاں تقسیم کی گئی۔ اس رپورٹ میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اردو اخبارات کے حوالے اور ان کے تبصرے شائع کئے گئے تھے اور روزنامہ اودھ نامہ کے ضمیمے کے پہلے صفحہ کی بعینہ تصویر شائع کی گئی تھی۔

پہلے نیشنل اردو فکشن ایوارڈ میں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کو اردو رائٹرس فورم کے کنوینر وقار رضوی مومنٹو پیش کرتے ہوئے

رام نائیک جی نے اپنے تین سال کے قیام کے دوران اپنے تیسرے سال کے کاموں پر روشنی ڈالنے کے لئے ۲۲؍اگست ۲۰۱۷ء کو (اپنے تین سال پورے ہونے کے دن) ایک پریس کانفرنس کی جس میں انھوں نے اپنی تین سال کی رپورٹ کی چھپی ہوئی کتاب کا اجرا کیا اور پریس والوں کو تقسیم کی۔ آزادی کے ۶۹ سال کی تاریخ میں پہلی بار راج بھون کی طرف سے ہندی کے ساتھ اردو میں بھی یہ رپورٹ چھپی اور وہاں تقسیم کی گئی۔ اس رپورٹ میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اردو اخبارات کے حوالے اور ان کے تبصرے شائع کئے گئے تھے اور روزنامہ اودھ نامہ کے ضمیمے کے پہلے صفحہ کی بعینہ تصویر شائع کی گئی تھی۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو سیاست سے بلند ہو کر زبان و تہذیب کے بارے میں توجہ دے۔

یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو سیاست سے بلند ہوکر زبان و تہذیب کے بارے میں توجہ دے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انھیں کیا ضرورت تھی کہ وہ اردو میں بھی اپنی رپورٹ شائع کراتے اس لئے کہ اس سے پہلے تو کوئی رپورٹ اردو میں نہیں شائع ہوئی اس میں ان کے اردو زبان اور لکھنؤ کی تہذیب سے لگاؤ کا بھی حصہ ہے۔

زبانوں کیلئے ان کے دل میں احترام پہلے سے ہوسکتا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اس لئے انہوں نے آتے ہی اُردو کے پروگراموں میں جانے میں کبھی تکلف نہیں کیا لیکن اُردو میں رچ بس جانے کی ایک وجہ ڈاکٹر عمار رضوی، پروفیسر شارب رُدولوی اور ڈاکٹر عباس رضا نیّر اور ان کے اسسٹنٹ انفارمیشن ڈائرکٹر انجم نقوی بھی رہے جس سے ان کی دلچسپی اُردو سے دن بدن بڑھتی گئی۔

اسی لئے جس عہد میں اُردو ایک خاص فرقے کی زبان مانی جاتی ہے اس زمانے میں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کی کتاب اور ان کی رپورٹ اُردو میں بھی شائع ہو، یہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے، ان کی یہ سوچ ہی دوسروں سے ان کو الگ کرتی ہے اور ان کی وسعت نظر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

❑❑❑

اردو، غالبؔ، تاج محل

رئیس الشاکری
علامہ شبلی لائبریری، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
موبائل: 9794228179

شام ابد یا صبح ازل
سچے اشارے سچا عمل
کل ہے آج تو آج ہے کل
یاد آئے شاہانِ مغل
اردو، غالبؔ، تاج محل

میرامن کا قصہ ہو
شعر و ادب کا سوداؔ ہو
مومنؔ، ذوقؔ ہو، انشاؔ ہو
نظم، رباعی اور غزل
اردو، غالبؔ، تاج محل

قطبؔ، ولیؔ ہو، میرؔ کہ دردؔ
اپنے ہنر میں سارے فرد
روح فزا ہے جن کی گرد
لاؤں کہاں سے کوئی بدل
اردو، غالبؔ، تاج محل

شعر و ادب کی جاگیریں
گنگا جمنی تعبیریں
مدھ ماتی کچھ تصویریں
چھلکے جیسے گنگا جل
اردو، غالبؔ، تاج محل

پرکھوں نے وہ پیڑ لگائے
من موہن جن کے سائے
پتہ پتہ چھو جائے
مایۂ جاں ہے پھول اور پھل
اردو، غالبؔ، تاج محل

لفظ ہمارے بات اُن کی
جھمکے ہیں آیات اُن کی
سب کیلئے سوغات اُن کی
نور بکف ہے جیسے کنول
اردو، غالبؔ، تاج محل

آؤ حرف ذات کہیں
تم سے رئیسؔ اک بات کہیں
دن کو کیسے رات کہیں
تیز ہوا، روشن مشعل
اردو، غالبؔ، تاج محل

غزل

اپنے بیمار کو سزا ہی دی
تم نے آخر دوا گرا ہی دی

جس سے رشتوں میں آ رہی تھی دراڑ
ہم نے وہ بات بھی بھلا ہی دی

وہ بھی ناراض ہو کے اٹھ ہی گیا
ہم بھی غصے میں تھے سنا ہی دی

منصف وقت کی عدالت میں
اپنے ہونے کی بھی گواہی دی

دل میں اک آرزو تھی سو ہم نے
دل سے وہ آرزو مٹا ہی دی

ہم بھی آداب کر کے اٹھ ہی گئے
زیر لب وہ بھی مسکرا ہی دی

خوں بہا ہم نے یوں لیا جاویدؔ
اپنے قاتل کو بھی دعا ہی دی

جاویدؔ اکرم
یاسمین منزل، مغل گارڈن، پلاٹ نمبر ۱۴، متقی پور، لکھنؤ
موبائل: 9621455583

غزل

گلی کوچے اگر بازار ہوں گے
بہت کم لوگ عزت دار ہوں گے

لہو میں عاجزی شامل ہے جن کے
نمائش کے لئے تیار ہوں گے

وہاں یہ سوچ کر جانا پڑے گا
کئی چینل، کئی اخبار ہوں گے

کسی صندوق، الماری میں جھانکو
قرینے سے رکھے شہکار ہوں گے

وطن سے جو نہیں کرتے محبت
دماغی طور پر بیمار ہوں گے

کہانی امن پر لکھی گئی ہے
لہو آمیز سب کردار ہوں گے

بدن کی ساری مٹی بہہ چکی ہے
مکانوں کے کہاں آثار ہوں گے

کنارہ کب نظر آئے گا جاویدؔ
سفینے کب ہمارے پار ہوں گے

ملک زادہ جاویدؔ
30-D، نیل گری اپارٹمنٹ، سیکٹر ۳۴، نوئیڈا
موبائل: 9899936228

غزل

گلوں کا مسئلہ کوئی نہ خنجروں کا تھا
سوال دونوں جہاں کے مقدروں کا تھا

دکھائی دیتے تھے شمس و قمر کی جو صورت
سنا ہے نیزوں پہ وہ قافلہ سروں کا تھا

بھرا ہوا ہے جو میدان سنگ ریزوں سے
سنا ہے معرکہ پھولوں کا پتھروں سے تھا

عمارتوں کے کھنڈر ہیں نہ تربوں کے نشاں
سنا ہے راج یہاں پر سکندروں کا تھا

خود ایک بھائی نے بھائی کو قتل کر ڈالا
سنا ہے فیصلہ دیوار اور دروں کا تھا

بتائے کون ہوا کیا یہاں تو گونگے ہیں
سنا ہے شہر کبھی یہ سخنوروں کا تھا

زمیں کی خاک پہ اب کیسے نیند آئے گی
سنا ہے شوق بڑا اس کو بستروں کا تھا

رہا نہ دونوں طرف کوئی بیٹھنے والا
سنا ہے جھگڑا پرانے چبوتروں کا تھا

اٹھا کے لے گئے بیٹی غریب کے گھر سے
سنا ہے ٹولہ یہ بستی کے لوفروں کا تھا

رفیعؔ لاج بچا لی خدائے برتر نے
سنا ہے حملہ شریفوں پہ کمتروں کا تھا

رفیع سرسوی
607، وجئے میموریئل پبلک اسکول، محلہ چھیوڑا، امروہہ
موبائل: 9837590546

غزل

جب سے مری جاناں نے پھیری ہے نظر اپنی
بے کیف ہے حددرجہ، یہ شام وسحر اپنی

پرشور ہواؤں نے کیا حال کیا سب کا
اب خیر مناتی ہے ہر شاخِ شجر اپنی

جس روز سے گزرا ہے لشکر کسی ظالم کا
اُس دِن سے لرزتی ہے یہ راہ گزر اپنی

کل جس نے اُجاڑی تھی دُنیا مرے ارماں کی
کیوں اُس کے دریچے پر رہتی ہے نظر اپنی

ہر ہاتھ میں پتھر ہے، ہر راہ میں کانٹے ہیں
ہو زیست بھلا کیسے پھولوں میں بسر اپنی

پُرکھوں کی وراثت کے ہم لوگ امیں ٹھہرے
دنیا میں جُدا سب سے ہے یار ڈگر اپنی

تنہائی کے عالم میں یہ سوچتا رہتا ہوں
اُس شوخ کی باتوں سے کیوں چشم ہے تر اپنی

ہر سمت سے راہوں میں خنجر ہی چلے ہم پر
''اب اور سنائیں کیا رودادِ سفر اپنی''

جب توڑ لیا تم نے ہر رشتۂ دل ہم سے
کیوں ڈھونڈتی رہتی ہے پھر تم کو نظر اپنی

یہ کیسے جزیرے میں پہنچے ہیں قدم اپنے
جس جا نہیں ملتی ہے جاویدؔ خبر اپنی

مشتاق جاویدؔ
P-121، خانسا پاپارہ، مٹیابرج، کلکتہ-۲۴
موبائل: 9674170148

غزل

گل زمینوں کا پتہ دیتی ہے خوشبو کی فصیل
سیرگاہیں ڈھونڈھ ہی لیتی ہیں احساسِ جمیل

ایک ہی منظر نظر آتا ہے تصویروں کے بیچ
یا مرے ہونٹوں کی کشتی یا تری آنکھوں کی جھیل

ہم جسے سورج سمجھ بیٹھے وہ تارا ہی نہ ہو
شام تک جھوٹی بھی ہوسکتی ہے سورج کی دلیل

جو تمہیں نزدیک لایا تھا وہ پل بیتا نہیں
چھا گیا ہے سیکڑوں صدیوں پہ اک لمحہ قلیل

کس سے پوچھیں آگ کو گلزار کرنے کا ہنر
سب کے سب نمرود ہیں لیکن نہیں کوئی خلیل

کیا عجب ہے غم عطا کر دے حیاتِ جاوداں
موت خود آ کر نکالے زندہ رہنے کی سبیل

منزلِ مقصود تک پہنچیں گے کیسے اے شریفؔ
جادۂ عشق و وفا بے نقشِ پا بے سنگ میل

شریفؔ قریشی
9/1، بھوسہ منڈی، فتح گڑھ، یوپی
موبائل: 9044674701

غزل

مزاج زندگی بھی معتدل ہے
خوشی میں یاس بھی کچھ کچھ مخل ہے

بڑی نامعتبر ہے زندگی بھی
خوشی دائم، نہ غم ہی مستقل ہے

ہمیں دکھلا کے توڑا ہے پیالہ
مقدر بھی بلا کا سنگدل ہے

ہمیں بے چین رکھتی ہے جو پیہم
یہ کیسی شئے لہو میں مشتمل ہے

مقدر میں لکھی تھی سنگساری
جنوں سے سنگ کیسا متصل ہے

یقیناً خوش تو اب ہوگا زمانہ
ہمارے پاس حسرت ہے نہ دل ہے

یہ منزل کون سی ہے بے حسی کی
زباں خاموش ہے، دل مضمحل ہے

کئی ممتازؔ اندیشے اُگے ہیں
بڑی زرخیز دل کی آب و گل ہے

ممتازؔ نازاں
602، نیو مہادا کالونی، گورے گاؤں ایسٹ، ممبئی
موبائل: 9867641102

غزل

کتنے دن، چار، آٹھ، دس، پھر بس
راس اگر آ گیا قفس پھر بس

جم کے برسات کیسے ہوتی ہے
حد سے باہر گئی اُمس، پھر بس

حادثے، واقعات، افواہیں
لوگ ہوتے ہیں ٹس سے مس، پھر بس

تیز آندھی کا گھر ہے ریگستان
اپنے خیمے کی ڈور کس، پھر بس

سب کے حالات پر سجاوٹ تھی
تم نے رکھا ہی جس کا تس پھر بس

تھی غلاموں کی آرزو تعمیر
لیکن آقا کا حکم بس، پھر بس

سو ارب کام ہوں تو دس نکلیں
عمر کتنی ہے سو برس، پھر بس

موت کا رونا کس لئے ثروتؔ
آپ کو کھا گئی ہوس پھر بس

ثروت جمالؔ
C-1، عظمیٰ اپارٹمنٹ، مدرسہ پارک، خرم نگر، لکھنؤ
موبائل: 9867641102

غزل

کس کا چہرہ ہے خیال وخواب میں
مچ گئی ہلچل مرے اعصاب میں

مل گئی شائستگی اسلاف کی
چاہئے تھا اور کیا اسباب میں

اک دیا دل میں مرے روشن ہوا
اک دیا جلنے لگا محراب میں

داستاں خود کو سنائی تھی مگر
گفتگو ہونے لگی احباب میں

کشتیاں ساحل سے اپنے جالگیں
لوگ پھنس کر رہ گئے گرداب میں

دور سے ہی آ گیا سب کو نظر
کرب سا کچھ چہرۂ شاداب میں

میری بھی تہذیب کے چرچے ہوئے
تھا سلیقہ اس کے بھی آداب میں

زندگی کو میں نے عادلؔ پڑھ لیا
خوف سا لکھا تھا ہر اک باب میں

ڈاکٹر عادلؔ حیات
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
موبائل: 9313055400

غزل

چل چلاؤ جرس کی قید میں ہے
قافلہ پیش و پس کی قید میں ہے

باغ سے باغباں کو کیا حاصل؟
پھول کا رس مگس کی قید میں ہے

موت صدیوں پہ ہے محیط مگر
زندگی کچھ برس کی قید میں ہے

ساری دنیا تو قید ہے دل میں
دل مگر اک نفس کی قید میں ہے

سو گلوں سے کھنچے کہ اک گل سے
مئے کا نشہ تو رس کی قید میں ہے

بجلیوں کو پتہ ہے اے سلماںؔ
آشیاں خار و خس کی قید میں ہے

سید سلمان عابدی
علی پور، کرناٹک، جنوب ہند
موبائل: 9916733603

غزل

محبت کے انوکھے تھے سبھی انداز کیا کرتے
رہے ہم بھی گریزاں آپ بھی ناراض کیا کرتے

صنم تجھ سے محبت کا بھلا آغاز کیا کرتے
لبوں نے کہنا چاہا پر نہ تھی آواز کیا کرتے

حبیبِ دل بھی کیا کرتے میرے دم ساز کیا کرتے
مجھے جب درد ہی تھا راس چارہ ساز کیا کرتے

ہجومِ شہر میں کھو جاتے ہیں ہم چین پانے کو
اکیلے میں ستاتی تھی تیری آواز کیا کرتے

مرے نازک سے دل کو اس نے پل میں توڑ ڈالا تھا
اسے بھاتی تھی ٹوٹے کانچ کی آواز کیا کرتے

سجا کر میں تبسم کتنے غم تم سے چھپاتی تھی
مگر افشاںؔ کہ تم بھی جان کر وہ راز کیا کرتے

شاہین افشاںؔ
موڑ ہُواں، شکار گنج چکیا، چندولی، یوپی
موبائل: 7488957860

غزل

اللہ کرم مجھ پہ جو تیرا نہیں ہوتا
خوشیوں سے بھرا دل کبھی میرا نہیں ہوتا

تیرے رُخِ روشن کا کرشمہ ہے وگرنہ
دنیا سے کبھی دور اندھیرا نہیں ہوتا

اللہ رے یہ شان بلالِ حبشی کی
دیتے نہ اذاں وہ تو سویرا نہیں ہوتا

ہوتی نہ کڑی دھوپ، ہوا تیز نہ چلتی
سورج کی شعاؤں کا جو پھیرا نہیں ہوتا

ہو جائے جہاں شام وہیں کر لیں بسیرا
ہم صحرا نوردوں کا تو ڈیرا نہیں ہوتا

اب آپ ہی بتلایئے کیوں شاخِ شجر پر
معصوم پرندوں کا بسیرا نہیں ہوتا

خوش رنگ گلستاں میں کبھی پھول نہ کھلتے
اے حسن ازل عکس جو تیرا نہیں ہوتا

لیتے نہ ضیاؔء کام اگر عزم جواں سے
ساحل پہ سفینہ کبھی میرا نہیں ہوتا

اشتیاق احمد ضیاؔء
شیر مسجد، شاہی پل، جونپور
موبائل: 9795293980

غزل

تو اسی کا ہے جسے خود سے عنایت ہوجائے
ورنہ دنیا میں تو دنیا سے محبت ہوجائے

میری خاموشی مگر تاب کہاں رکھتی ہے
تجھ سے دو بات جو کرلوں تو ریاضت ہوجائے

اپنی شمشیر کو سجدے کی اجازت دے دے
میرے دشمن کو مرے سر سے عقیدت ہوجائے

تیری محفل سے اٹھوں اور سجاؤں دربار
آخری عمر میں تھوڑی سی عبادت ہو جائے

آگ میں پھول کھلے پھول میں خوشبو تیرے
دیکھتے دیکھتے یہ خواب حقیقت ہو جائے

شورِ گریہ ہی میں دب جاتی ہے دستک تیری
ورنہ دروازۂ دل بابِ اجابت ہو جائے

میں تو مر جاؤں ترے نام کو رسوا کر کے
اور دنیا میں اسی بات کی شہرت ہو جائے

ڈاکٹر خالد عبادی
معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)
موبائل: 9835480456

مغل دور میں فن صحافت کا ارتقاء

نیلوفر حفیظ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی

موبائل: 7500984444

مغل دور ہندوستان کی تاریخ میں ہر اعتبار سے زرین ترین دور کہلا جانے کا مستحق ہے سلاطین مغل رزم و بزم دونوں کے مرد میدان تھے وہ اعلیٰ درجے کے فاتح ، کشور ستان اور ناظم حکومت ہونے کے علاوہ بہترین ادب پرور، علم نواز اور سخن شناس بھی تھے مغل حکمرانوں کا دور ہندوستان میں ظہیر الدین محمد بابر کی آمد سے شروع ہوکر بہادر شاہ ظفر کی وفات پر ختم ہوتا ہے یہ زمانہ کم وبیش ساڑھے تین سو برس کی طویل مدت کا احاطہ کئے ہوئے ہے مغل دور حکومت میں کشور ہند میں وہ عظیم انقلابات وتغیرات رونما ہوئے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ پوری طرح بدل کر رکھ دیا یوں تو فارسی زبان ھندوستان میں غزنویوں کی آمد کے بعد ہی سے سرکاری اور دفتری ضرورتوں کے پیش نظر استعمال کی جانے لگی تھی اور علمی وادبی مناظرے ومباحثے بھی اسی زبان میں ہوا کرتے تھے مگر مغلوں کی سرپرستی میں اس زبان نے زندگی کے ہر شعبے میں اس قدر وسیع پیمانے پر ترقی حاصل کی کہ آج تک اس کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی کہ کسی خارجی زبان نے کسی ملک میں اس قدر وسعت وکشادگی پائی ہو کہ زندگی کا ہر پہلو اس سے متاثر ہوا ہو ویسے تو مغل حکمرانوں نے ہندوستانی معاشرے کے ہر شعبے پر اپنے ہمہ گیر اور راسخ اثرات مرتب کئے لیکن ان سب سے قطع نظر ہم صرف اس دور کی خبر نویسی کے متعلق ہی گفتگو کریں گے مغل حکمرانوں نے دیگر شعبوں کی طرح خبر رسانی کے نظام کو بہتر بنانے پر بھی اپنی توجہ خاص طور پر مبذول رکھی مغل حکمرانوں نے اطلاعات کی فراہمی ،ان کی بہم رسانی اور ترویج واشاعت کو جو وسعت و استحکام بخشا اس کی مثال اس سے قبل کے ہندوستان میں دیکھنے کو نہیں ملتی مغل دور حکومت کے اخبار رسانی کے بہترین نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب امداد صابری رقم طراز ہیں:

''مغلیہ دور میں نیوز ایجنسی کا انچارج ایک وزیر بریدالممالک ہوتا تھا جو تمام صوبوں سے خبریں حاصل کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا ہر صوبہ کا بریدخطوط کے ذریعے مرکز میں خبریں روانہ کرتا تھا۔''(۱)

اس عہد میں جبکہ فاصلوں اور ذرائع مواصلات کی دشواریوں کے پیش نظر خبر رسانی بہت مشکل اور تکلیف دہ فعل تصور کی جاتی تھی لیکن مغل حکمرانوں اور بادشاہوں کو ملک کے ہر حصے سے درست خبریں پہونچائی جاتی تھی خبروں کو جلد از جلد پہونچانے کے لئے گماشتے یا کارندے مقرر کئے جاتے ہیں جو برق رفتاری سے خبریں بادشاہ کے حضور پہنچادیا کرتے تھے۔ ہر صوبے کے صدر مقام میں مغل شہنشاہوں کا دفتر معلومات رہتا تھا۔

اس عہد میں جبکہ فاصلوں اور ذرائع مواصلات کی دشواریوں کے پیش نظر خبر رسانی بہت مشکل اور تکلیف دہ فعل تصور کی جاتی تھی لیکن مغل حکمرانوں اور بادشاہوں کو ملک کے ہر حصے سے درست خبریں پہونچائی جاتی تھی خبروں کو جلد از جلد پہونچانے کے لئے گماشتے یا کارندے مقرر کئے جاتے ہیں جو برق رفتاری سے خبریں بادشاہ کے حضور پہنچادیا کرتے تھے ہر صوبے کے صدر مقام میں مغل شہنشاہوں کا دفتر معلومات رہتا تھا اور بادشاہ کو ہمہ حالات سے مطلع کرتا تھا اس دفتر معلومات میں موجود وقائع نگار اور روز نامچہ نویس ملک کے نظم ونسق کے تمام معاملات وحوادثات تحریر کرتے ان کے علاوہ سوانح نویس عام خبروں سے متعلق حالات وواقعات قلم بند کرتے اور پھر ان کا خلاصہ بادشاہ کو روانہ کیا جاتا تھا تاکہ وہ سلطنت کے اندورنی وبیرونی حالات سے پوری طرح باخبر رہے۔

مغل حکمرانوں نے خبر رسانی کے شعبے کو وسعت وترقی دینے میں کسی بھی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ان بادشاہوں کی بے پناہ ذہانت وفطانت نے اخبار نویسی اور خبر رسانی کے طریقے کو بقائے دوام بخشا مغل شہنشاہوں نے محکمہ خبر رسانی کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اس میں گرانقدر اضافے بھی کئے ظہور الدین محمد بابر ابراھیم لودھی کو شکست دے کر جب دہلی کا بادشاہ بنا تو اس نے خبروں کی ترسیل کے لئے باضابطہ طور پر ایک عملہ مقرر کیا اس عملے کے کارندوں کا سب سے بڑا اور اہم کام خبروں کی جمع وترتیب کرنا اور بادشاہ کے پیغام کو عوام تک پہنچانا ہوتا تھا اس بادشاہ زیرک نے ملک میں گھوڑوں کی ڈاک کا بھی بہترین انتظام کیا تھا جیسا کہ اس نے

اپنی تزک میں خود بھی لکھا ہے:

''میں نے ان لوگوں کے پاس جو لاہور میں تھے گھوڑوں کی ڈاک بیٹھا کر دوڑا دیا اور کہلا بھیجا کہ جنگ نہ کرو سیالکوٹ میں میرے پاس چلے آؤ''(۲)

بابر کو خبر رسانی کے محکمے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس نے از دہلی تا کابل گھوڑوں کی ڈاک کا ایک منظم ڈاک کا سلسلہ قائم کیا تھا جس کے ذریعے جلد از جلد خبروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پہونچانے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا بابر ایک دور اندیش اور دقیق بین حکمراں تھا اس کو اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ عوام کو بادشاہ کے تمام حکمت عملیوں سے باخبر رکھے جانا ضروری ہے تا کہ عوام بادشاہ کے زیادہ سے زیادہ نزدیک رہے یہی وجہ ہے کہ بابر نے حکومت میں کچھ ایسے افراد کا بھی تعین کر رکھا تھا جو بادشاہ کے تمام اہم اور ضروری فیصلوں سے عام رعایا کو مطلع کریں تا کہ رعایا کے درمیان بادشاہ کے خلاف کوئی غلط فہمی یا افواہ راہ نہ پائے بابر کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بے حد معمولی اور بے حد عام سے نظر آنے والے واقعات وحالات سے بھی رعایا کو باخبر رکھنا لازم سمجھتا تھا اس نے اپنی تزک میں ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ رانا سانگا پر فتح بخشیں گے تو میں اپنی سلطنت میں ہر قسم کے محصول معاف کر دوں گا میں نے اس معافی کا اعلان کرنا ضروری جانا اور محرروں کو حکم دیا کہ اس مضمون کے فرمان جاری کریں اور دور دور اس کی شہرت دی جائے''(۳)

مذکورہ بالا عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابر ایک باہوش اور ذہین بادشاہ تھا بابر کے جانشین نصیر الدین ھمایوں نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی اخبار نویسی اور خبر رسانی کی اس روایت کو قائم رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا بالخصوص اس اخباری تنظیم کو جو بابر کی قائم کردہ تھی اس کی نگہ داشت کا خوب اہتمام کیا یہ درست ہے کہ ھمایوں خبر رسانی کے اس نظام میں خاطر

بابر ایک باہوش اور ذہین بادشاہ تھا بابر کے جانشین نصیر الدین ھمایوں نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی اخبار نویسی اور خبر رسانی کی اس روایت کو قائم رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا بالخصوص اس اخباری تنظیم کو جو بابر کی قائم کردہ تھی اس کی نگہ داشت کا خوب اہتمام کیا یہ درست ہے کہ ھمایوں خبر رسانی کے اس نظام میں خاطر خواہ اضافہ تو نہ کر سکا کیونکہ اس کی بیشتر زندگی اندرونی وبیرونی شورشوں کے فرو کرنے میں گزری۔

خواہ اضافہ تو نہ کر سکا کیونکہ اس کی بیشتر زندگی اندرونی وبیرونی شورشوں کے فرو کرنے میں گزری بااین ھمہ اس نے خبروں کی ترسیل کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش ضرور کی اس کے عہد میں جنگ پر روانہ ہونے والی افواج کے ساتھ نامہ نویسوں کا ایک گروہ بھی بھیجا جاتا تھا تا کہ بادشاہ کو جنگ کے حالات سے من وعن

ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر نے محکمہ خبر رسانی میں زبردست انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں ہر ضلع میں خبر رساں اور واقعہ نویس مقرر کئے گئے دارالحکومت میں مقتدر، تجربہ کار اور قابل اعتماد لوگوں کو تعینات کیا گیا اور ان کو وسیع اختیارات دیئے جانے لگے تا کہ خبر رسانی کا دائرہ وسعت و کشادگی حاصل کرے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دورۂ اکبری ہی میں پہلی بار کی خبر نویسی سے متعلق کسی قدر سنجیدہ اور باقاعدہ کوشش کی گئی تھی۔

باخبر رکھا جا سکے غیاث الدین ابن ھمام الدین معروف بہ خواند میر عہد ہمایونی کا سب سے بڑا اخبار نویس اور مورخ تھا جس کی بے پناہ ذہنی صلاحیتوں اور دور اندیشی کے پیش نظر ھمایوں کی طرف سے اس کو ''امیر الاخبار'' کا لقب عطا کیا گیا تھا عہد ھمایوں کی اخبار نویسی کی صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جتنی بھی سوانحی اور واقعاتی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان کا زیادہ تر مواد خبر ناموں سے اخذ کردہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں خبر نویسی کا معقول انتظام موجود تھا۔

''مغلوں کے زمانے میں جتنی سوانحی اور واقعاتی کتابیں لکھی گئی مثلاً شیخ زین کی ''طبقات بابری'' اخواند امیر کی ''ھمایوں نامہ'' اور جوھر آفتاب چی کی ''تذکرۃ الواقعات'' یہ سب ایک خاص دور پر محیط ہیں اس لئے ان کا انداز اخبار نویسانہ معلوم ہوتا ہے اور زیادہ تر اخبار نویسوں کے خبر ناموں پر مبنی ہیں''(۴)

ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر نے محکمہ خبر رسانی میں زبردست انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں ہر ضلع میں خبر رساں اور واقعہ نویس مقرر کئے گئے دارالحکومت میں مقتدر، تجربہ کار اور قابل اعتماد لوگوں کو تعینات کیا گیا اور ان کو وسیع اختیارات دیئے جانے لگے تا کہ خبر رسانی کا دائرہ وسعت و کشادگی حاصل کرے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دورۂ اکبری ہی میں پہلی بار کی خبر نویسی سے متعلق کسی قدر سنجیدہ اور باقاعدہ کوشش کی گئی تھی ہر چند کہ دور اکبری سے قبل بھی مغل حکمرانوں نے خبر رسانی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے مساعی جمیلہ اختیار کی تھیں اور ان میں کامیاب بھی ہوئے تھے لیکن عہد اکبری میں اخبار نویسی کے نظام کو جو تقویت اور استحکام حاصل ہوا اس کا اندازہ ابو الفضل کی اس عبارت سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

''واقعات سلطنت کا قلمبند کرنا نہ صرف ملک و دولت کی ترقی اور انتظام قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ ہر طبقے اور ہر مجلس کی رونق بحال

رکھنے کے لئے بھی لازمی ہے اگرچہ قدیم زمانے میں بھی اس طریقے کا کچھ پتہ چلتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے اہل زمانہ کو اس مبارک عہد میں آگاہی ہوئی''(۵)

شہنشاہ اکبر سلطنت کے تمام حالات وواقعات کو جاننے کے لئے سخت بے چین رہتا تھا اس کی خواہش رہتی تھی کہ رعایا کی ہمہ کارگزاریوں سے متعلق اس کے پاس اطلاعات موجود رہیں یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے سلطنت کے ہمہ حالات وواقعات کو قلمبند کرنے کے لئے چار قسم کے افراد مقرر کئے تھے

۱۔ تیلچی ۲۔ واقعہ نویس

۳۔ خوش نویس ۴۔ تعلیقہ نویس

ان میں تیلچی اور واقعہ نویسوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ملک کے الگ الگ مقامات میں رونما ہونے والے تمام واقعات وحادثات کو احاطہ تحریر میں لاتے تھے خوش نویسوں اور تعلیقہ نویسوں کی ذمہ داری ان واقعات یا روزنامچوں کو زیبا انداز میں نقل اور تلخیص کرنے کی ہوتی تھی اور یہ چاروں قسم کے افراد اپنے اپنے ذمہ کاموں کو پوری چابک دستی اور تندہی سے اپنی خدمات انجام دیتے تھے اور جلد از جلد بادشاہ کے پاس خبریں پہنچانے کا اہتمام کرتے تھے۔

عہد اکبری کی خبر نویسی کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں دور دراز کے علاقوں میں تجربہ کار، جہاندیدہ اور با آثر لوگ اخبار نویسی یا خبر رسانی کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ان اخبار نویسوں کی ایک بڑی تعداد ملک کے ہر بڑے مقام پر موجود رہتی اور خبروں کی حصول یابی کے لئے انتھک کوشش کرتی یہ جماعت پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی تھی اور بجلی کی سی سرعت سے قابل ذکر خبریں بادشاہ کے حضور پہنچادیا کرتی تھی اکبری عہد میں ڈاک اور اخبار رسانی کے بہترین انتظام کی تعریف کرتے ہوئے آقا امداد صابری رقمطراز ہیں:

''ہر گاؤں میں پانچ میل کے فاصلہ پر گھوڑے اور چند ہرکارے مقرر کردیئے جاتے تھے جہاں یہ لوگ رہتے تھے اس کو ڈاک چوکی کہتے تھے، سرحد کی امراء کی ضروری عرضداشت اور فرمان اس چوکی سے ملتے تھے سوار شدہ ہرکارہ اس کو دوسری چوکی پر پہونچادیتا تھا چنانچہ شب وروز کی راہ طے کر کے یہ ہرکارے آگرہ سے احمد آباد ڈاک پانچ روز میں پہونچادیتے تھے۔۔۔۔ چار ہزار ہرکارے اس کام پر مامور تھے جو گھوڑے پر سوار ہوکر ڈاک پہونچاتے تھے اور جو ہرکارے

''ہر گاؤں میں پانچ میل کے فاصلہ پر گھوڑے اور چند ہرکارے مقرر کردیئے جاتے تھے جہاں یہ لوگ رہتے تھے اس کو ڈاک چوکی کہتے تھے، سرحد کی امراء کی ضروری عرضداشت اور فرمان اس چوکی سے ملتے تھے سوار شدہ ہرکارہ اس کو دوسری چوکی پر پہونچادیتا تھا چنانچہ شب وروز کی راہ طے کر کے یہ ہرکارے آگرہ سے احمد آباد ڈاک پانچ روز میں پہنچادیتے تھے۔ چار ہزار ہرکارے اس کام پر مامور تھے۔

پیدل ڈاک لے جاتے تھے وہ سات سو میل دس روز میں طے کرتے تھے۔''(۶)

شہنشاہ اکبر کے خبر نگاری کے طور طریق کو دورۂ جہانگیری میں نہ صرف جوں کا توں قائم رکھا گیا بلکہ اس میں عصری تقاضوں کے پیش نظر بہت سے اہم بدلاؤ بھی کئے گئے شہنشاہ جہانگیر نے خبر رسانی کا ایک نیا طریقہ بھی ایجاد کیا جب شہنشاہ کو اس بات کا علم ہوا کہ عباسی خلیفہ بغدادی کبوتروں کو پیغام رسانی کے لئے استعمال کرتے ہی تو بادشاہ نے اپنے ملک میں بھی کبوتر بازوں کو حکم دیا کہ وہ کبوتروں کو نامہ بری سکھائیں جناب امداد صابری عہد جہانگیری کی خبر نویسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ان کبوتروں کو اس طرح سے تربیت دی جاتی تھی کہ اگر یہ مانڈو سے پرواز کرتے تو ایک پہر میں برہان پور پہونچ جاتے تھے ۷۔ دورۂ جہانگیری کی خبر نویسی کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دور میں واقعہ نویس اور خبر نگار روزنامچوں کا ریکارڈ بھی اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کو فوراً دیکھا جاسکے اور صحیح خبر سے آگاہی ہو سکے ایک مرتبہ جہانگیر نے روزنامچہ نویسوں اور وقائع نگاروں کو حکم دیا کہ وہ ان شکار کئے ہوئے جانوروں اور پرندوں کی تفصیل مہیا کریں جو جہانگیر نے وقتاً فوقتاً شکار کئے تھے تو اہلکاروں اور نامہ نویسوں نے فوراً ریکارڈ کی مدد سے جملہ اعداد وشمار فراہم کر دیئے ان کی بیان کردہ اطلاعات سے پتہ چلا کہ جہانگیر نے بارہ سال کی عمر سے لیکر وقت تحریر تک کل ۲۸ ہزار ۵۳۲ جانوروں اور پرندوں کا شکار کیا ہے ۸۔ جہانگیر کے یہاں خبر رسانی کے طریقے کو کس قدر اہمیت وارزش حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی وقائع نگار یا روزنامہ نویس کوئی غلط بات لکھ دیتا اور اس کی خبر بادشاہ کو ہوجاتی تو ایسے شخص کو سخت سے سخت سزا دی جاتی امداد صابری نے ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں واقعہ نویسوں نے اپنی لاپرواہی اور غلط بیانی کے سبب سخت سزا پائی:

''جب دربار جہانگیری میں ایرانی سفیر آیا تو بادشاہ نے اس کو شراب کا جام دیا غلط فہمی کی وجہ سے درباری واقعہ نویسوں نے جام شراب دینا بخشی سے منسوب کر کے لکھ دیا بادشاہ نے جب روزنامچہ دیکھا تو غصہ سے بے آپے ہوگیا اس نے کسی پر جرمانہ کیا کسی کو کوڑے لگوائے بعض کو لات گھونسے سے مارنے کا حکم دیا جس میں مجروح بھی ہوئے اور ایک آدھ مرگیا''(۷)

جہانگیر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تزک

جہانگیری'' میں بھی اخبارنویسی اور واقعہ نگاری کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور وقائع نگاروں کی صفات اور ان کے تقررات کے منفعت بخش نتائج کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے تزک جہانگیری میں جا بجا ایسی عبارات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن کی نوعیت پیغام رسانی یا خبر نگاری سے بڑی حد تک شباہت رکھتی ہے صاحب کتاب نے اپنی اس تزک میں لاہور کے ایک واقعہ نویس کا مرسالہ بھی نقل کیا ہے جس میں ہوا کے گرم بگولے کی زد میں آ کر تقریباً نو افراد کے ہلاک ہوجانے کی خبر بیان کی گئی ہے اسی طرح کے اور بھی بہت سے ایسی اطلاعات اور واقعات تزک میں بیان کئے گئے ہیں جن کی نوعیت اطلاع اور خبر کی سی ہی ہے۔

ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے دورۂ حکومت میں اخبارنویسی حکومت ہند کا جز ولاینفک بن چکی تھی اس شہنشاہ بزرگ نے بھی اپنے آباؤ اجداد کے محکمہ خبر رسانی کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کو تابندگی وتقویت دینے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی شاہ جہاں نے اپنے دور حکومت میں ایسے لوگوں کو نامہ نویسی کے منصبوں پر فائز کرنا شروع کیا جو غیر معمولی ادراک وفہم کے مالک ہوتے تھے اور جن کی شخصیت میں ایمانداری اور حقیقت نویسی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا اس بادشاہ کے یہاں دیانتدار، غیر جانبدار، ذہین اور حقیقت پسند نامہ نگاروں کو اعزازات وانعامات سے بھی نوازا جاتا تھا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی اور مالی امداد ہو سکے اور وہ بغیر کسی کوتاہی ولاپرواہی کے اور زیادہ محنت ولگن سے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں شاہ جہاں کے مشہور نامہ نویسوں میں محمد امین قزوینی، محمد وارث اور چندر بھان برھمن وغیرہ وہ عظیم علمی وادبی شخصیات ہیں جو عرصہ دراز تک وقائع نویسی کے فرائض کو پوری سچائی او ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کا دور آتے آتے وقائع نویسی اور خبر رسانی کا یہ فن اپنے پورے شباب پر پہونچ چکا تھا عالمگیر کے دور سے خبر نامے اخبار کہلائے جانے لگے اورنگ زیب کی فوج کو ایسے اخبار پہونچائے جاتے تھے جن میں ملک بھر میں ظہور پذیر ہونے والے اہم واقعات کے بارے میں پوری دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ تحریر کیا جاتا تھا ان اخباروں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ شاہی فوجیں حالات سے پوری طرح باخبر رہیں اس کے علاوہ خود اورنگ زیب عالمگیر واقعہ نگاروں کی خبروں کی روشنی میں سرکشوں اور باغیوں کو سخت سزائیں دیتا تھا بادشاہ کی طرف سے ان اخبار نویسوں اور نامہ نگاروں کی ایمانداری اور صداقت کا بھی وقتاً فوقتاً امتحان لیا جاتا تھا اگر شہنشاہ کو یہ معلوم ہوجاتا کہ خبر نویسوں نے شہزادوں، وزیروں یا امیروں وغیرہ سے دوستانہ مراسم رکھے ہوئے ہیں اور خبر رسانی کے فرائض پوری ایمانداری کے ساتھ انجام نہیں دے رہے ہیں تو انہیں ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جاتا تھا اور بعض اوقات ان خیانت یا خود غرضی کرنے والے وقائع نویسوں کو شدید سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں ان اخباروں کو پوری آزادی حاصل تھی اگر اخبار میں کوئی ایسی خبر ہوتی تھی جو حکومت کے خلاف لیکن حقیقت پر مبنی ہو تو اخبار سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی تھی عالمگیر کے انصاف کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ جب بنگال کے کسی اخبار نے شہنشاہ اور اس کے پوتے مرزا عظیم الشان کے تعلقات پر سخت الفاظ میں تنقید کی اور اس کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی لیکن بادشاہ کی طرف سے خبر نویس کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی اس سے اندازہ ہوتا ہے عالمگیر ایک حقیقت پسند اور وسیع النظر حکمراں تھا۔

دورۂ عالمگیری میں صرف سرکاری اخبار ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ نجی اخباروں کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا ان نجی اخباروں کے خبر نویس عموماً تاجروں اور امیروں وغیرہ کے ملازم ہوتے تھے اور عام طور پر ان کے مفاد کی خبریں لکھ کر بھیجتے تھے تاکہ وہ حالات سے باخبر رہیں ان اخباروں میں بعض اوقات انتظامی، سیاسی اور اقتصادی خبروں کو بھی جگہ دی جاتی تھی مگر اس قسم کی خبریں کم ہی ہوتی تھیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دورۂ حکومت کے اخبارات پر سرسری انداز سے ہی نگاہ ڈالنے پر اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں قلمی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے خبر نگاروں اور وقائع نویسوں کا شعور صحافت نہایت بالیدہ اور پختہ ہو چکا تھا وہ بے خوف وتردد خبریں بیان کرتے تھے ان کا مقصد حقائق کو پیش کرنا ہوتا تھا۔ اس شہنشاہ بزرگ کی دقیق بینی، وسیع القلبی اور دور اندیشی نے اس دور میں فن صحافت کو جو رونق اور عروج بخشا وہ متقدمین ومتاخرین مغل شہنشاہوں کے یہاں شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر عہد مغلیہ کا آخری سب سے بڑا اور طاقتور بادشاہ گزرا ہے اس کے انتقال کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا مختلف علاقوں میں نوابوں اور صوبے داروں نے حکومت کی کمزوری کا اندازہ لگا کر اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں مرکزی حکومت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور برطانوی حکومت اپنا تسلط قائم کرتی چلی گئی لیکن مغلیہ بادشاہوں کے آخری دور میں بھی خبر رسانی، اخبار نگاری اور ڈاک کا طریقہ وہ ہی پرانا طرز قائم رہا جو متقدمین کے یہاں موجود رہا تھا جیسا کہ جناب امداد صابری نے ڈاکٹر سرن کے حوالے سے مغل حکمرانوں کے آخری دور کی خبر نویسی کے سلسلے میں لکھا ہے:

’’ وقائع نویس بخشی کے ماتحت ہوتے تھے صوبہ میں صوبہ دار سے لے کر محالدار تک کے اعمال کی رپورٹ درج ہوتی تھی جو براہ راست بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی تھی خفیہ اطلاع کا وقائع نویسی سے علیحدہ شعبہ ہوتا تھا، یہ کام سوانح نویس، خفیہ نویس یا پرچہ نویس انجام دیتے تھے وہ ملک کے جملہ چھوٹے چھوٹے حالات بادشاہ کے کانوں میں پہونچا دیتے تھے اس محکمہ کی اہمیت اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ صوبیدار اور دیوان بھی اس سے کانپتے تھے‘‘(۸)

متاخرین مغلوں کے دور حکومت میں بھی تمام ناداری وکسمپرسی کے باوجود قلمی اخبارات کی روایت قائم رہی فرخ سیر جیسے کمزور بادشاہ کے دور حکومت میں بھی تقریباً چار ہزار خبر نویس اور وقائع نگار سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے جو پوری دیانتداری کے ساتھ بادشاہ کو خبریں پہونچایا کرتے تھے اس کے علاوہ خود مختار ریاستوں میں بھی خبروں کی ترسیل کا باقاعدہ وباضابطہ نظام موجود تھا پنجاب، میسور، حیدرآباد، دکن اور اودھ وغیرہ میں متعدد وقائع نویس خبر رسانی کے فرائض انجام دیتے تھے مثلاً رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں ان کی ریاستوں سے کئی قلمی اخبارات نکلتے تھے جن کے نام پنجاب اخبار، پشاور اخبار اور ہندوستان اخبار وغیرہ تھے مرہٹہ قوم نے خبروں کی باقاعدہ ترتیب وجمع آوری کے لئے آٹھ اراکین پر مشتمل ایک باضابطہ محکمہ قائم کیا ہوا تھا میسور میں حیدر علی نے بھی بہت سے وقائع نگار اور خفیہ جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو ریاست کے اندرونی وبیرونی حالات کی خبریں بہم پہونچاتے تھے اور ریاست کے نوابوں کے نمک خوار بنے رہتے تھے خود مختار صوبوں میں اخباری نظام کی موجودگی کے باوجود سلطنت مغلیہ کی مرکزیت کے کم زور پڑ جانے کی وجہ سے متعدد نامہ نویس بے یارو مددگار ہوگئے اور برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی ضرورتوں اور عیارانہ حکمت عملیوں کے پیش نظر ان کو اپنے یہاں روزگار فراہم کر دیا انھوں نے بے روزگار خبر نگاروں اور اخبار نویسوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر لی تاکہ وہ اس ملک کو برباد اور اپنی حکومت کو مضبوط کر سکیں۔

قلعہ کا آخری اخبار نویس مامراج تھا جو آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت میں خبر نویسی کی خدمات انجام دیتا تھا اور حکومت کی اہم خبریں سانڈنی سواروں کے ذریعے پہونچائی جاتی تھی اس شہنشاہ کم نصیب کی موت کے ساتھ نہ صرف ایک پُر شکوہ دور کا خاتمہ ہوگیا بلکہ ہندوستان جیسے وسیع وعریض کو غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پڑا، ابتدائی میں انگریز حکمرانوں نے خبریں پہونچانے کے لئے مغل حکمرانوں کے طریقوں پر ہی عمل کیا لیکن گزرتے وقت اور سائنس کی نئی نئی ایجادات کے پیش نظر صحافت کے اس فن میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔

ماخذ وذرائع

۱۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۳۲، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۳ء

۲۔ بابر نامہ، ظہیر الدین محمد بابر مترجم محمد قاسم صدیقی، ص ۴۳، ترقی اردو بیورو ۱۹۹۳ء

۳۔ بابر نامہ، ظہیر الدین محمد بابر مترجم محمد قاسم صدیقی، ص ۹۰، ترقی اردو بیورو ۱۹۹۳ء

۴۔ ادو صحافت انیسویں صدی میں، ڈاکٹر طاہر مسعود، ص ۳۲، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی ۲۰۰۲ء

۵۔ آئین اکبری جلد اول، ابوالفضل مترجم محمد فدا علی طالب، ص ۳۸۱، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء

۶۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۱۹، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۳ء

۷۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۲۱، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۳ء

۸۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۲۴، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۳ء

❑❑❑

’نیا دور‘ کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے ’نیا دور‘ اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ در اصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی. ایف. ایس. سی.، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔

سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی پہلو

عبیداللہ ناصر
536/2/309، کھدرا، ڈالی گنج، لکھنؤ
موبائل: 8052503455

اساتذہ کے وہ برمحل اشعار جو اکثر و بیشتر محفلوں میں ترکی بہ ترکی استعمال کئے جاتے تھے اور بزلہ سنجی میں ان اشعار کے مصرعوں کے استعمال کو لوگ داد دیتے نہیں تھکتے تھے، اب وہی اشعار، وہی مصرعے، وہی ضرب المثل، جملے اور محاورے سوشل میڈیا میں چھائے ہوئے ہیں۔

ٹوئٹر پر تو بطور خاص اساتذہ اور مشاہیر کے منتخب کلام کے وہ اشعار اور مصرعے جو کسی کو نشانہ ہدف بنا سکتے تھے، ان کا بخوبی استعمال کیا رہا ہے۔ کوئی سیاسی رہنما ہو یا مشہور شخصیت، اپنی بات کو پرزور ڈھنگ سے اور دیرپا اثر کے لئے وہ لوگ اردو کے ان اشعار کے مصرعوں کا خوب استعمال کررہے ہیں۔ ٹوئٹر پر چونکہ الفاظ کی پابندی ہے اور اپنی بات آپ کو محدود لفظوں میں ہی بیان کرنی ہے تو اس کے لئے اردو کے اشعار سے بہترین ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ اسی لئے ٹوئٹر پر اردو شاعری چھائی ہوئی ہے۔ ٹوئٹر پر اردو کے اشعار اور مصرعوں کا استعمال غیر اردو داں طبقہ بھی کثرت سے کررہا ہے۔

www.rekhta.org جیسے ہی کھلتی ہے، کوئی بڑا شاعر اپنا کلام سنا رہا ہوتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے فرہان اختر نے اپنے دادا مضطر خیرآبادی کا کلام سنایا۔ جشن ریختہ میں شبانہ اعظمی نے اپنے ابا کیفی اعظمی اور جاوید اختر نے اپنے والد جاں نثار اختر کا کلام پڑھا۔

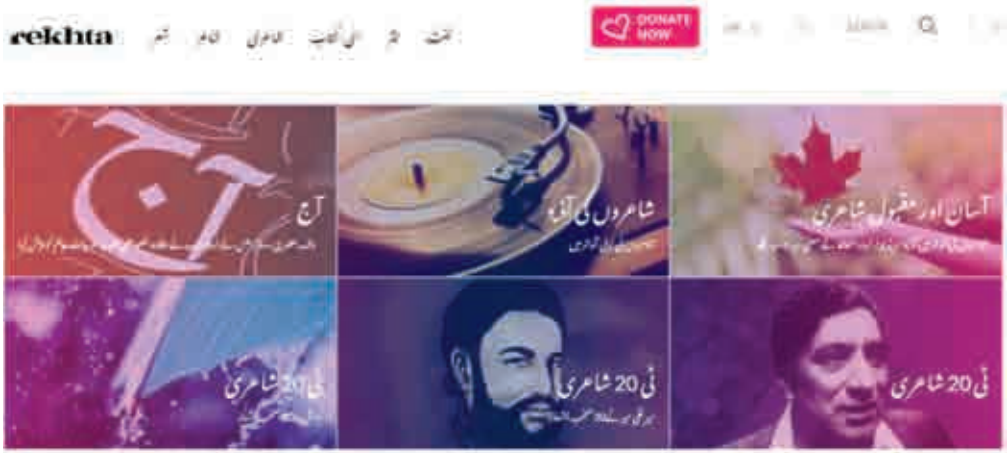

یہ سوشل میڈیا کا کمال ہے کہ ہم جب چاہیں ایک کلک پر اساتذہ اور مشاہیر کا کلام پڑھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں۔ پروین شاکر کو مشاعرے میں پڑھتے ہوئے دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی آواز انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ مجروح سلطانپوری بھی سوشل میڈیا پر غزل سرا ہیں۔ سوشل میڈیا یعنی انٹرنیٹ پر منحصر ایسا پلیٹ فارم جس پر ہر ایک کو اپنی بات کہنے اور اپنے پسندیدہ اشعار اور تخلیقات کو پوسٹ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

سوشل میڈیا نے ہر خاص و عام کو اپنی پسند اور ناپسند پر مبنی ادبی تخلیقات حاصل کرنے اور پوسٹ کرنے کا لامحدود اختیار دے دیا ہے۔ سوشل میڈیا کی ہی بدولت سرحدوں کی پابندی بے معنی ہوگئی اور یورپ ہو یا امریکہ، روس ہو یا افریقہ، پوری دنیا کی تخلیقات ہمیں دستیاب ہیں۔ اب کسی کتاب پر لگائی گئی سرکاری پابندی بھی پہلے کی بہ نسبت کم اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ انٹرنیٹ پر ایسی سائٹس موجود ہیں جو ان تخلیقات کو شائع کردیتی ہیں۔

آزادی کا ایسا تصور سوشل میڈیا نے ہمیں عطا کیا ہے جس کا خواب کبھی فیض احمد فیض نے دیکھا تھا، وہ آزادی جس کے لئے دنیا بھر کے تعلیم یافتہ طبقہ نے طرح طرح کی جد و جہد کی، وہ آزادی سوشل میڈیا سے میسر آئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ فیس بک پر شعراء کی بہت بڑی تعداد عالمی پیمانے پر ایک دوسرے سے جڑ گئی ہے۔ یہ فیس بک کی کامیابی کی معراج ہی کہی جائے گی کہ فیس بک نے اپنے شاعر پیدا کردئے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جو صرف فیس بک پر ہی اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور انہیں ہزاروں لائکس اور کمنٹس حاصل ہوتے ہیں۔ ان شعراء کی شہرت کا معیار انہی لائیک اور کمنٹس پر منحصر ہے۔ ان شعراء کو

کسی ٹیلی ویژن اور رسالے کی ضرورت نہیں۔ فیس بک نے ان کے ہزاروں لاکھوں دیوانے بنا دئے ہیں۔ فیس بک نے ایک ایسی نئی نسل پیدا کر دی ہے جو ان شعراء کی زبردست مداح ہے۔

فیس بک پر لاکھوں ایسے اکاؤنٹس ہیں جو مختلف ادبی تنظیموں، اداروں اور شخصیات کے ہیں۔ خواہ وہ دہلی کے ہوں یا لندن کے، نیویارک کے ہوں یا کراچی کے، برلن کے ہوں یا دبئی کے، سب آپس میں ایک دوسرے سے روز بروز بلکہ ہر لمحہ ہر لحظہ ایک دوسرے کے رابطہ میں رہتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی اس روش کا اردو زبان و ادب کو زبردست فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ عمدہ تخلیقات کی آمد و رفت اب کاغذ کی محتاج نہیں رہی۔ سوشل میڈیا کی شکل میں اسے ایک ایسا ذریعہ مل گیا جو لامحدود ہے۔ فیس بک نے تو شاعر پیدا کئے ہی، ادیب بھی پیدا کئے۔ واٹس اپ نے ایسے لاکھوں گروپ تیار کر دئے جن پر ہر وقت کوئی کسی شعر پر سر دھن رہا ہوتا ہے یا اساتذہ کے کسی قول پر بحث میں مشغول ہوتا ہے۔ تحقیق کر رہے ریسرچ اسکالرس کو اب گھڑی گھڑی جس کے تس کے آگے دست سوال دراز کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے، اسے تمام مواد انہیں واٹس اپ اور فیس بک کے ذریعہ اساتذہ مہیا کرا دیتے ہیں۔ اب ذرا اس پس منظر پر بھی نظر ڈالیں کہ پیغام رسانی خبر رسانی اور جذبات کو الفاظ کی شکل دینا دنیا کے قدیم ترین پیشوں اور مشاغل میں شمار ہوتا ہے۔ ہندو دیومالائی کہانیوں کے مطابق نارد منی کو دنیا کا سب سے قدیم صحافی سمجھا جاتا ہے جو ایک دیوتا کی باتیں اور انکے پیغامات دوسرے دیوتاؤں تک پہنچاتے تھے۔ اس زمرہ میں حضرت جبریل کو بھی رکھا جا سکتا ہے جو خدائی پیغامات اور احکامات نبیوں اور رسولوں تک پہنچاتے تھے۔ قدیم زمانے میں جب زندگیاں جنگلوں اور غاروں میں گزرتی تھیں تب انسان اونچے درختوں پر چڑھ کر یا تو آگ کے ذریعہ کوئی پیغام دوسرے قبیلوں تک پہنچاتا تھا یا پھر بڑے بڑے نگاروں کو پیٹ کر پیغام رسانی کرتا تھا ان دونوں طریقوں کے کچھ مخصوص انداز

> سوشل میڈیا نے ہر خاص و عام کو اپنی پسند اور ناپسند پر مبنی ادبی تخلیقات حاصل کرنے اور پوسٹ کرنے کا لامحدود اختیار دے دیا ہے۔ سوشل میڈیا کی ہی بدولت سرحدوں کی پابندی بے معنی ہو گئی اور یورپ ہو یا امریکہ، روس ہو یا افریقہ، پوری دنیا کی تخلیقات ہمیں دستیاب ہیں۔ اب کسی کتاب پر لگائی گئی سرکاری پابندی بھی پہلے کی بہ نسبت کم اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ انٹرنیٹ پر ایسی سائٹس موجود ہیں جو ان تخلیقات کو شائع کر دیتی ہیں۔

ہوتے تھے جس سے دوسرے قبیلے والے سمجھ جاتے تھے کہ پیغام کیا اور کس مقصد کا ہے۔

انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ہی ساتھ خبر اور پیغام رسانی کے ذرائع بھی ترقی کرتے گئے۔ ڈھول نگاڑوں اور آگ کے بجائے اب کبوتروں اور دیگر پرندوں کا استعمال کیا جانے لگا پھر ہرکاروں کا

> سوشل میڈیا کی اس روش کا اردو زبان و ادب کو زبردست فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ عمدہ تخلیقات کی آمد و رفت اب کاغذ کی محتاج نہیں رہی۔ سوشل میڈیا کی شکل میں اسے ایک ایسا ذریعہ مل گیا جو لامحدود ہے۔ فیس بک نے تو شاعر پیدا کئے ہی، ادیب بھی پیدا کئے۔ واٹس اپ نے ایسے لاکھوں گروپ تیار کر دئے جن پر ہر وقت کوئی کسی شعر پر سر دھن رہا ہوتا ہے یا اساتذہ کے کسی قول پر بحث میں مشغول ہوتا ہے۔

سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ بھی ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ ڈاک کا نظام شروع ہوا جس میں ایک چوکی سے ڈاک دوسری چوکی تک گھوڑوں کے ذریعہ پہنچا دی جاتی۔ اس طرح یہ منزل مقصود تک پہنچتی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے اس محاذ پر بھی انقلاب برپا کر دیا۔ چھاپا خانوں کی ایجاد نے اخباروں کو جنم دیا جو مسلسل ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آج کے جدید ترین دور میں داخل ہو گیا ہے۔ جب چشم زدن میں ایک اخبار کی ہزاروں کاپیاں نکال دیتا ہے۔ اخباری صنعت گزشتہ کچھ برسوں میں ہی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے جو بذات خود ایک معجزہ لگتی ہے۔

اپنی گفتگو کے لئے ہم ذرائع ابلاغ یا ماس میڈیا کو تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات، رسائل اور جرائد۔ دوم الیکٹرانک میڈیا یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ سوم سوشل میڈیا یا انٹرنیٹ میڈیا۔ پرنٹ میڈیا کے بام عروج پر پہنچنے کے ساتھ ہی ساتھ الیکٹرانک میڈیا نے بھی نہ صرف اپنے قدم جمائے بلکہ ترقی کی منازل بھی طے کرتے ہوئے آج انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر بن گئی ہے۔ پہلے ہمارے پاس صرف ریڈیو تھا لیکن اسّی کی دہائی میں ٹیلی ویژن نے دستک دی۔ ہندوستان میں پہلے صرف دوردرشن تھا جو چوبیس گھنٹوں میں کچھ گھنٹوں تک اپنے پروگرام نشر کرتا تھا۔ خبروں، ڈراموں، ادبی محفلوں مشاعروں، کاشتکاری اور باغبانی جیسے مفاد عامہ کے پروگرام اس میں نشر ہوتے تھے۔

۹۰ کی دہائی میں جب ہندوستانی معیشت کھولی گئی اور پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا میں پرائیویٹ اداروں کی شمولیت کا دروازہ کھلا تو لاتعداد پرائیویٹ چینل منظر عام پر آئے اور آج ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اس نے اپنی پہنچ پرنٹ میڈیا سے کہیں زیادہ بنا لی ہے کیونکہ ابھی ہونے والی کوئی واردات کی اطلاع اخبار آپ کو کل صبح دے گا جبکہ ریڈیو وار ٹیلی ویژن فوراً ہی آپ کو پل پل کے حالات سے باخبر کرتے رہیں گے پھر بھی عوام کو ایک تشنگی کا احساس رہتا ہے اور یہ تشنگی اخبار پڑھے بغیر

پوری نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اخبارات کے مضامین اور اداریوں کو اب بھی قاری ٹیلی ویژن کے مباحثوں سے زیادہ اہمیت اور اعتبار کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سوشل میڈیا ایک بالکل نیا لیکن بیحد موثر ابلاغ کا ذریعہ بن کر ابھرا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار یا اپنی بات کہنے کے لئے ایک عام آدمی کو اخبار یا ٹی وی چنیل پر کوئی سورس تلاش کرنا پڑتا ہے۔

عام شکایت ہے کہ ان ذرائع ابلاغ میں سماج کے کمزور اور دبے کچلے طبقوں کی نمائندگی نا کے برابر ہے اور اب ان میں ان طبقوں کے مسائل کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے جو سوشلزم کے دور میں دی جاتی تھی۔ ان حالات میں یہ سوشل میڈیا غریب کی لاٹھی بن کر سامنے آئی ہے۔ آج فیس بک، ٹویٹر، واٹس اپ پر کوئی بھی معمولی تعلیم یافتہ شخص اکاؤنٹ کھول کر اسکے ذریعہ اپنی بات دنیا کے سامنے لاسکتا ہے اور حکومت وانتظامیہ اسکی نوٹس لینے کو مجبور ہو جاتی ہے۔ بہار عرب جس نے عرب آمروں کی کرسیوں کی چولیں ہلا دی تھیں اسی سوشل میڈیا پر ایک پھل فروش پر ایک پولیس افسر کے مظالم کی داستان ڈال دینے کے بعد انقلاب آ گیا تھا۔ بہت سے ضرورت مندوں کی ضروریات ان ذرائع ابلاغ پر پوسٹ کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ فوراً سامنے آ کے دور کر دیتا ہے۔ لکھنؤ کی پی جی آئی میں زیر علاج ایک مریض کو خون کی ضرورت تھی دہلی میں بیٹھے ان کے ایک دوست یا رشتے دار نے یہ ضرورت اپنے فیس بک پوسٹ پر ڈال دی۔ لکھنؤ میں اس مریض کو خون دینے کے لئے بہت سے لوگ پہنچ گئے۔ اسی طرح غریب بچوں کی فیس کتابیں اور دیگر ضروریات کی خبر ملتے ہی لوگ مدد کے لیے آگے آجاتے ہیں۔

سماجی بیداری لانے میں بھی سوشل میڈیا اہم کارنامے انجام دے رہی ہے۔ سوشل میڈیا کی افادیت کا اندازہ اس لطیفے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے پڑوسی لڑکے سے کہا کہ بیٹا! فیس بک پر میرا اکاؤنٹ کھول دو اور ڈی پی میں کسی خوبصورت لڑکی کا فوٹو ڈال دو۔ لڑکے نے حیرت سے پوچھا: بابا! یہ کیوں؟ تو ان بزرگ نے رقت آمیز لہجے میں کہا کہ میرا جوان بیٹا بہت دنوں سے غائب ہے۔ اسکی کوئی خیر خبر بھی نہیں ملی، سوچتا ہوں خوبصورت لڑکی کی تصویر دیکھ

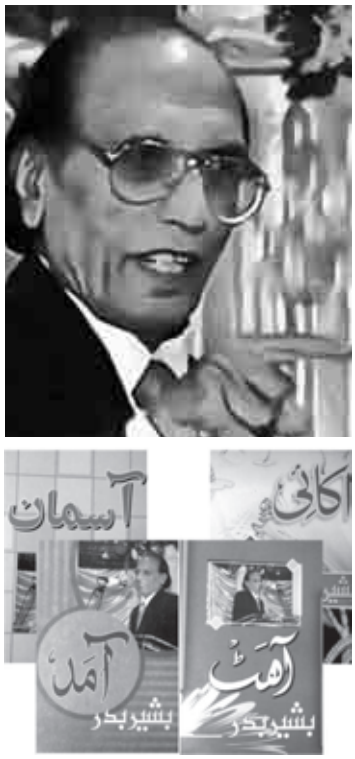

مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بستر علالت پر ہیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ جلد ہی ہم ان پر بھی ایک گوشہ شائع کریں گے۔ بشیر بدر کی علالت اور ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ان کی اہلیہ سے گفتگو بھی اس میں شامل ہوگی۔

کر وہ شاید دوستی کی درخواست بھیج دے اور مجھے اسکا پتہ مل جائے۔ اگر چہ یہ ایک لطیفہ ہی ہے لیکن اس سے سوشل میڈیا کی افادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہی ہے دوسرا رخ بہت ہی بدنما اور کریہہ ہے۔ سماج دشمن عناصر اسکا بہت ناجائز فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ خواتین کو دوستی کا پیغام بھیجنا قبول ہو جانے کی صورت میں ان کے ساتھ غیر شریفانہ، غیر مہذب سلوک کرنا، یہاں تک کی کبھی کبھی بلیک میل کئے جانے تک کے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ جو خواتین دوستی کی درخواستیں قبول نہیں کرتیں انکے ساتھ بیہودہ فقرہ بازی ان کی کردار کشی وغیرہ سے بھی یہ بدقماش لوگ باز نہیں آتے۔

اسکے علاوہ سماج میں منافرت پھیلانے یہاں تک کی فساد کرا دینے تک کے کاموں میں سوشل میڈیا کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ فوٹو شاپ کے ذریعہ فرضی جھوٹے اور دوسری جگہوں کے فوٹو ڈال کر عوام کو اکسانے ورغلانے اور انہیں تشدّد پر آمادہ کرنے، مخالفین کی کردار کشی، ان کے سلسلہ میں جھوٹی خبریں پھیلانے، انہیں بدنام کرنے کے بھی معتدد واقعات سامنے آچکے ہیں۔ سائنس کے سلسلہ میں جو کہا گیا تھا کہ یہ بہترین غلام لیکن بدترین آقا ہے۔ وہ سوشل میڈیا پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔ اگر اسکا مثبت استعمال کیا جائے تو یہ نعمت خداوندی سے کم نہیں لیکن اگر اس کا منفی استعمال کیا جائے تو یہ عذاب الٰہی بھی بن سکتی ہے۔

سوشل میڈیا کے منفی استعمال کو روکنے کے لئے حکومت نے سائبر قوانین بنائے ہیں۔ اب اس طرح سوشل میڈیا پر سماجی منافرت پھیلانے، کسی کو بدنام کرنے، اس کی کردار کشی اور دیگر منفی اور غیر سماجی کاموں کے خلاف متاثرین کو قانون کی مدد حاصل ہے۔ پولیس محکمہ میں اس کے لئے الگ سے شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں ماہرین کی بڑی تعداد موجود ہے یہ ہمہ وقت کام کرتے رہنے والا شعبہ ہے اور اس کی خدمات کسی بھی وقت حاصل کی جاسکتی ہیں

سوشل میڈیا نعمت بھی ہے اور زحمت بھی، اس کا کیسے استعمال کیا جائے یہ استعمال کرنے والے پر منحصر ہے۔

❑❑❑

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں

فانیؔ بدایونی
۱۸۷۹ء ۱۹۴۱ء

غزل

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کی کیا ہستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

غزل

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

کیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گذری چھوٹ گیا

منزل عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

جدید غزل کے نمائندہ شاعر فانیؔ
جاتا ہے لیکن حقیقت دراصل اس کے
شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔
نکھار ہے جو دوسروں کے یہاں مشکل
ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی سے پُر
شہرت کا عالم یہ ہے کہ سیکڑوں ایسے اشعار
نہیں ہیں۔ شوکت علی خان ۱۳ ستمبر
بدایونی کے نام سے شہرت کی بلندیوں
پر ادارۂ نیا دور کی جانب سے بطور خراج

کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

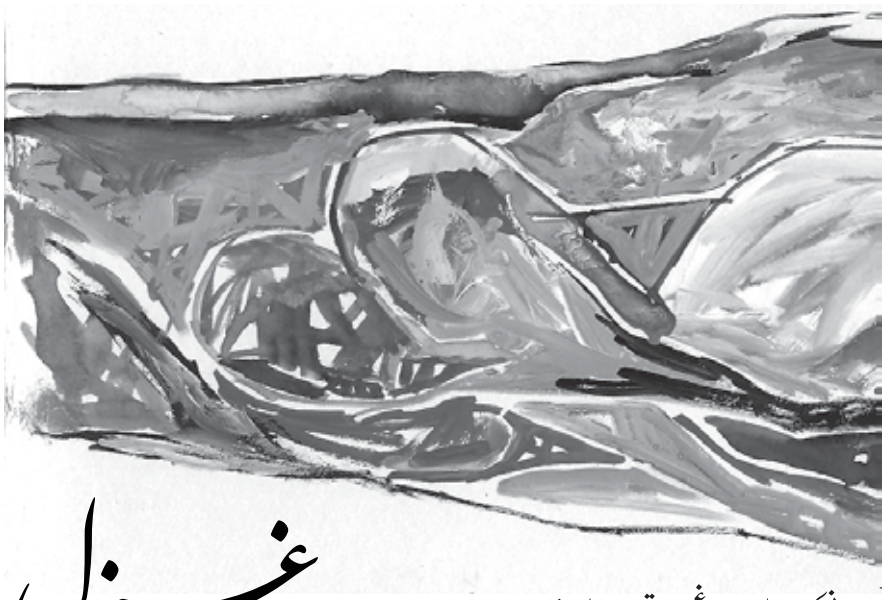

غزل

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

کعبہ کو دل کی زیارت کے لیے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

وحدت حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

چشم ساقی اثر مئے سے نہیں ہے گل رنگ
دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

لوح دل کو غم الفت کو قلم کہتے ہیں
کن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

کس کی آنکھیں دم آخر مجھے یاد آئی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانیؔ
آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے

بدایونی کو عام طور پر مصورِ غم اور قنوطیت کا شاعر مانا
بر عکس بھی ہے۔ فانی کا نام اپنے ہم عصر جدید
فانی کے یہاں جذبات اور خیالات میں ایک ایسا
سے نظر آتا ہے۔ ان کے وہاں تصوف بھی بھرپور
ان کے سیکڑوں اشعار لوگوں کو ازبر ہیں۔ ان کی
ان کے نام سے منسوب کر دئے گئے جوان کے
۱۸۷۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور جلد ہی فانیؔ
پر پہنچ گئے۔ انکے ۱۳۸ویں یوم ولادت کے موقع
عقیدت پیش ہیں انکی تین غزلیں۔

الکٹرانک میڈیا، صحافت کی بدلتی تصویر

عرفان علی
44/108، تالاب گنگی نکل، لکھنؤ
موبائل: 9456821889

ٹیلی ویژن عوامی ذرائع ترسیل کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ اخبار اور ویڈیو کے مقابلے یہ نسبتاً نیا میڈیم ہے۔ اس لئے اس کی ساخت اور کارکردگی کے بارے میں بھی جاننا بہت ضروری ہے لیکن سب سے پہلے بدلتی صحافت کا مختصر تعارف۔

ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن کی ابتدا ۱۵ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو یونیسکو کے ذریعہ ایک خصوصی پروجیکٹ کے تحت تجربے کے طور پر ہوئی۔ تاہم اس کا باضابطہ آغاز ۱۵ر اگست ۱۹۶۵ء کو دوردرشن پر ایک گھنٹے کے پروگرام سے ہوا۔ ڈاکٹر وکرم سارا بھائی کی کوشش سے ۱۹۶۷ء میں احمد آباد میں اسپیس اپلی کیشن سینٹر (SAC) اور اسی سال گجرات کے کھیڑا مقام پر (SITE) یعنی Satellite Instructional Television Experiment کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ٹی وی نشریات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس سفر میں کئی اہم پڑاؤ آئے جن کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا سیٹیلائٹ ۱۹ر اپریل ۱۹۷۵ء کو مدار (Space) میں بھیجا گیا۔ تب سے اب تک ۳۰۰ سے زیادہ سیٹیلائٹس مدار میں بھیجے جا چکے ہیں۔

ابتدا میں صرف Terrestrial Broadcasting یعنی زمین سے زمین پر نشریات کی سہولیات تھیں۔ اس میں موسم کی رخنہ اندازی سے کبھی تصویر دھندلی ہو جاتی تھی اور کبھی آواز غائب ہو جاتی تھی تاہم سیٹیلائٹس لانچ ہونے کے بعد سیٹیلائٹ ٹی وی چینلس کا دور آیا۔ جس نے الیکٹرانک میڈیا کی تصویر ہی بدل ڈالی۔ آج ہمارے ملک میں سیکڑوں ٹی وی چینل چل رہے ہیں۔ سیٹیلائٹ چینل میں سنگل ٹی وی ٹرانس میٹر سے ارتھ اسٹیشن پر بھیجے جاتے ہیں جو انہیں سیٹیلائٹ پر بھیجتا ہے اور سیٹیلائٹ ان Symbols یعنی تصاویر کو Dish Antenna پر واپس بھیج دیتا ہے جس سے ٹی وی نشریات کی گھر گھر رسائی ہو جاتی ہے۔ Direct Broadcasting Satellite تکنیک بھی وجود میں آ چکی ہے جس نے ساری سرحدیں منہدم کر دی ہیں۔ آپ اپنے گھر بیٹھے دنیا کا کوئی بھی چینل دیکھ سکتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا کا سماج پر اثر

دور حاضر میں الیکٹرانک میڈیا کی طاقت اور اثر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ سماج کو بدلنے، رائے عامہ کو ہموار کرنے اور پروپیگنڈہ کے لئے الیکٹرانک میڈیا انتہائی موثر ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ میڈیا کے آلات جدید زندگی کی علامت بن چکے ہیں اور ان کے سبب عوام کے طرز فکر اور لائف اسٹائل میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔

اسپاٹ رپورٹنگ

ٹی وی چینلس کی اثر پذیری میں Live Telecast اور Spot Reporting نے سب سے اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے۔ جب کوئی رپورٹر کسی واقعہ یا حادثہ کی جائے واقعہ سے رپورٹنگ کرتا ہے تو ناظرین پر اس کا سیدھا اثر ہوتا ہے۔ مناظر کی سیدھی تصویر ان کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ ناظرین تصویروں اور مناظروں کے براہ راست مشاہدے سے نتیجے اخذ کرتے ہیں اور اسی کے مطابق ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں جو رائے عامہ کو ہموار کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

کارپوریٹ کا دخل

سرکاری ٹی وی چینل دوردرشن کے بعد نجی ٹی وی چینلوں کی آمد نے الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ بازاری مسابقت نے پیشہ ورانہ و تکنیکی مہارت کے ساتھ منفی اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ آزادی سے پہلے اور بعد میں صحافت کو ایک مشن تصور کیا جاتا تھا لیکن اکیسویں صدی کی تیز رفتار ترقی نے اس تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں نے کارپوریٹ گھرانوں نے میڈیا کے شعبہ میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ یہ کارپوریٹ گھرانے میڈیا پر اجارہ داری قائم کرنے کے لئے ہر اس چینل کو خرید رہے ہیں جو عوام میں مقبول ہے اور ان کے مفادات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے تجارتی گھرانے ریلائنس گروپ کی نیوز 18 میں سرمایہ کاری اس کی سب سے واضح مثال ہے جس نے نیوز 18 کے نیشنل چینلوں کے ساتھ ای ٹی وی کے علاقائی زبانوں کے چینل بھی حاصل کر لئے ہیں۔ سینئر صحافی پی سائی ناتھ نے اپنی تحقیق میں کارپوریٹ دخل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے طنز کیا تھا کہ بہت جلد میڈیا میں 'سب کا مالک ایک' جیسی صورت حال آنے والی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا اور اردو زبان

ابلاغ کے تمام ذرائع میں اردو کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ سنیما سے لے کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک اردو زبان کی شیرینی ہر جگہ کام آتی ہے۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا میں اس کی اہمیت اور ضرورت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ٹی وی چینلوں کی لانچنگ کے بعد اردو زبان کے چلن میں اضافہ ہوا ہے۔ اردو اپنی پیدائش سے ہی عوامی رابطے کی زبان رہی ہے۔ پورے ملک میں ہندی کے ساتھ اردو ہی واحد زبان ہے جو ہر علاقے اور خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کے برجستہ جملے اور سرخیاں کانوں کو بھلی لگنے کے ساتھ رائے عامہ پر تیزی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اردو کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے پہلے اردو چینل کا آغاز جناب راموجی راؤ نے حیدرآباد کی سرزمین سے ۱۵؍اگست ۲۰۰۱ء میں کیا جن کی مادری زبان اردو نہیں تیلگو ہے لیکن ان کی اردو نوازی نے اردو چینل لانچ کر کے تاریخ رقم کر دی۔ ان کے بعد سہارا گروپ نے عالمی سہارا اور دوردرشن نے ڈی ڈی اردو کے مستقل چینل شروع کئے۔ حال ہی میں ذی میڈیا نے ذی سلام کے نام سے ۲۴؍گھنٹے کا نیوز چینل شروع کر کے اس میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو پر مسلمانوں کی زبان ہونے کی تہمت لگائی جاتی ہے لیکن مذکورہ چاروں اردو چینلوں میں سے ایک بھی کسی مسلمان کی ملکیت نہیں ہے۔

ٹی وی چینل کے اثرات

ذرائع ابلاغ میں سب سے زیادہ موثر اور تیز رفتار ٹی وی چینل ہیں۔ ان کی ایک بریکنگ نیوز آن واحد میں پورے ملک میں تہلکہ مچا دیتی ہیں لیکن اسی میں اس کا منفی پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ کبھی کبھی کچھ غیر ذمہ دار نیوز چینل بلا تصدیق ایسی خبر نشر کر دیتے ہیں جو پورے ملک کو ہیجان میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خبروں کے انتخاب میں بھی دلتوں، مسلمانوں اور دیگر کمزور طبقات کو منفی انداز میں پیش کرنے کی شکایتیں اٹھنے لگی ہیں۔ میڈیا کے تجزیہ نگار الیکٹرانک میڈیا کو گودی میڈیا اور بکاؤ میڈیا جیسے بدنام القاب سے پکارنے لگے ہیں۔ عوام میں ٹی وی چینلوں کی مقبولیت کے ساتھ ان کے اعتبار میں بھاری کمی آرہی ہے۔

ٹی وی مباحثے (Debate)

نجی چینلوں کی مقبولیت میں Live Reporting کے ساتھ کرنٹ افیئرس پر مباحثوں یعنی Debate نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان مباحثوں سے ایک چھوٹا سا موضوع راتوں رات مسئلہ بن جاتا ہے۔ مباحثوں میں شامل ہونے والے نمائندے اور دانشور سیلبریٹیز بن جاتے ہیں تاہم کچھ چینل اور بحث میں حصہ لینے والے ان مواقع کا بیجا فائدہ اٹھانے کی کوشش کے نتیجہ میں پوری میڈیا کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ملک کی دوسری بڑی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ دلت بھی الیکٹرانک میڈیا کو اتنا مخالف سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ٹی وی اور میڈیا ان کے مسائل اور موضوعات کو منفی انداز میں پیش کرتا ہے۔

غیر اہم موضوعات کو اہمیت کے ساتھ نشر کرنے پر بھی سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ ای ٹی وی چینل میں ۱۶؍سالہ خدمات کے دوران میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ جب بھی حکومت کو عوامی ناراضگی یا کسی بڑی دشواری کا سامنا ہوتا ہے تب کوئی نا کوئی ایسا جذباتی موضوع منظر عام پر آجاتا ہے کہ سب لوگ اسی کے بارے میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ اس میں کسی سیاسی پارٹی کی تخصیص نہیں ہے۔ اقتدار میں آنے والی جماعت عوامی مسائل سے نظریں چرانے اور توجہ ہٹانے کے لئے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ آج بھی ہمارے ملک میں کسانوں، کامگاروں اور کمزور طبقات کے بنیادی مسائل اور ضروریات کو پرائم ٹائم بھی جگہ نہیں مل پاتی ہے۔

آن لائن اور سوشل میڈیا

الیکٹرانک میڈیا میں آن لائن اور سوشل میڈیا کے خوشگوار اضافے نے اوپر مذکورہ خلش کو کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے ہر انسان کی رسائی سائبر اسپیس میں ممکن بنا دی ہے۔ آن لائن نیوز پورٹل کے ساتھ اسمارٹ فوج کے فیچرس نے انٹرنیٹ تک رسائی رکھنے والے ہر انسان کو اطلاعات کے خزانے کے ساتھ اپنی خبریں اور تاثرات نے مذکورہ خلش کو کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے ہر انسان کی رسائی سائبر اسپیس میں ممکن بنا دی ہے۔ آن لائن نیوز پورٹل کے ساتھ اسمارٹ فون کے فیچرس نے انٹرنیٹ تک رسائی رکھنے والے ہر انسان کو اطلاعات کے خزانے کے ساتھ انہیں خبریں اور تاثرات شیئر کرنے کا اہل بنا دیا ہے۔

آن لائن میڈیا اور سوشل میڈیا پر آنے والی خبریں اور ویڈیو لمحوں میں ہی وائرل کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ ان میں فیس بک کے بعد ٹوئیٹر اور واٹس اپ نے کمال کر دیا ہے۔ آن لائن میڈیا کے تحت چلنے والے نیوز پورٹل، بڑے بڑے اخبارات، ٹی وی چینل اور میڈیا گھرانوں کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ ان کی طاقت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر اخبار اور نیوز چینل اپنا نیوز پورٹل بھی چلا رہے ہیں۔

آن لائن اور سوشل میڈیا اہل اردو کے لئے بھی بیحد مفید اور کارآمد ہیں۔ حالانکہ ابھی اردو کی معیاری ویب سائٹس اور پورٹل کی کمی ہے لیکن www.urdu.net اور www.rekhta.org جیسی ویب سائٹس کے ساتھ اردو نیوز پورٹل بھی کامیابی کے ساتھ گامزن ہیں۔ ان میں News18 کی اردو ویب سائٹ کے ساتھ The Wire نے بھی اردو کے میدان میں قدم رکھ دئے ہیں۔ سوشل سائٹس پر اردو کے برجستہ جملے، محاورے اور اشعار بھی خوب رواج پا رہے ہیں تاہم اہل اردو کو ان مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے منظم کوششوں کی ضرورت ہے۔

□□□

جابر حسین
247 ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ
موبائل: 9431602575

بند لفاف

میں نے کندھے پر ایک ہلکی چادر ڈالی، اور موسم کا انداز لگانے کے لئے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف جھانکا۔

یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ باہر کی دھند کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی ہے۔ ایسے میں باہر نکلنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

تمہارے دوست تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے، میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ میں نے آواز ان سنی کردی، اور دروازہ بند کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون کا رسیور اٹھا کر الگ رکھ دیا اور ڈائری کے کھلے صفحات کے بیچ کہانی کا آخری سرا ڈھونڈنے لگا۔

دوستوں سے نہیں مل پانے کا ملال میرے دل کے کسی کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ باقی دوست تو آس پاس سے ہی آئے تھے، لیکن رمیش اور اس کی بیوی حال ہی میں، تھوڑے دنوں کے لئے، دوسرے ملک سے آئے تھے۔

بیوی دوسرے ملک کی شہری تھی۔ ان کے اعزاز میں شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں دعوت رکھی گئی تھی۔ دعوت میں یونیورسٹی کے ایک ساتھ پڑھے دوستوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔

رمیش میرے گہرے دوستوں میں تھا۔ برسوں ہم ایک ہی ہوسٹل میں رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک شام گزارنا اچھا لگتا۔ ایم اے کے امتحان میں دونوں کو برابر نمبر ملے تھے۔ تب میرے کچھ اساتذہ نے رمیش کے سیاسی اثر رسوخ رکھنے والے والد کے رول پر شک ظاہر کیا تھا۔

لیکن اس واقعہ کو تو ایک طویل عرصہ گزر گیا۔

میرے نمبر پر فون ضرور آ رہے ہوں گے، میں نے دل میں سوچا۔ رسیور تو میز پر رکھا تھا، گھنٹی بجتی تو کیسے۔

ڈائری والی کہانی مجھے آج رات کسی صورت

دوستوں سے نہیں مل پانے کا ملال میرے دل کے کسی کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ باقی دوست تو آس پاس سے ہی آئے تھے، لیکن رمیش اور اس کی بیوی حال ہی میں، تھوڑے دنوں کے لئے، دوسرے ملک سے آئے تھے۔
بیوی دوسرے ملک کی شہری تھی۔ ان کے اعزاز میں شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں دعوت رکھی گئی تھی۔ دعوت میں یونیورسٹی کے ایک ساتھ پڑھے دوستوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔

مکمل کرنی ہے، یہ سوچ کر میں نے دوستوں سے ملنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

کوئی گھنٹے بھر بعد کہانی کا آخری حصہ لکھا جا چکا تھا۔ میں نے صفحات سنبھال کر رکھ دیئے۔ خواہش ہوئی کہ دروازہ کھول کر موسم کا جائزہ لوں۔

دھند کی چادر اب بھی ماحول پر چھائی ہے، لیکن اس کی تہیں گہری نہیں رہ گئی ہیں۔ سڑک کے ایک کنارے بجلی کی روشنی، جو کچھ دیر قبل دھند سے پوری طرح ڈھنک گئی تھی، اب صاف نظر آنے لگی ہے۔ روشنی سے میرے آنگن کے پیڑ پودے بھی کچھ کچھ نظر آ رہے ہیں۔

کیا مجھے اب باہر نہیں نکلنا چاہئے، میرے اندر سے کسی نے مجھے پھر ٹوکا۔ اتنی دیر ہوگئی، اب تو کھانا بھی ختم ہوگیا ہوگا، اور سارے دوست مایوس گھر لوٹنے کی تیاری میں ہوں گے۔

میں نے اپنے اندر کی آواز پھر ٹھکرا دی۔

کیا میں واقعی موسم کی دھند سے پریشان ہوکر باہر نکلنا نہیں چاہتا۔ یا کوئی اور وجہ ہے۔ وجہ ہے تو کیا ہے۔

میرے اندر بیٹھی آواز مجھے کمزور ہوتا دیکھ حملہ آور ہوگئی۔

موسم کی دھند کے سوا اور کیا وجہ ہوسکتی ہے، میں نے اپنے آپ سے سوال کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اب تو دھند چھٹ رہی ہے۔ روشنی کی پرچھائی بھی نظر آنے لگی ہے۔ جب تک تم ہوٹل پہنچو گے، موسم اور بھی صاف ہوجائے گا۔ آواز کی رٹ جاری ہے۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ رسیور وہیں رکھا ہے جہاں میں نے اسے رکھ چھوڑا تھا۔ اسے اپنی جگہ کیوں نہیں رکھ دیتے، آواز پھر سنائی دی۔ اب اتنی رات گئے کون تمہیں فون کر کے پریشان کرے گا۔ دوست تو سارے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے ہوں گے۔

اس بار میں اندر کی آواز ان سنی نہیں کر سکا۔

میرا ہاتھ اپنے آپ رسیور کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحہ رسیور سیٹ پر رکھا تھا۔

سیٹ پر رکھتے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے اپنے فیصلے پر افسوس ہونے لگا۔

فون کی گھنٹی لگاتار بجتی جارہی ہے۔ اب میں کیسے پتہ کروں، کس کا فون ہے۔ کالر آئی ڈی میں نے اپنی ضد سے نہیں لگایا۔ میں اسے جاسوسی کا آلہ مانتا رہا ہوں۔ اس درمیان فون دوبار کٹا، لیکن فون آنا بند نہیں ہوا۔

فون اسی طرح بجتا رہا تو میری دھڑکنیں تیز ہونے لگیں گی، مجھے اندیشہ ہوا۔

یہ سوچ کر دوبارہ فون کٹنے پر میں نے رسیور سیٹ سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

کمرے کا ماحول پرسکون ہوگیا ہے۔

میں نے کہانی کے صفحات اٹھائے اور انہیں پھر سے پڑھنے لگا۔ جگہ جگہ قلم چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

کچھ دیر کام کرنے کے بعد میں سونے چلا گیا۔

صبح اٹھنے میں دیر ہوگئی۔ دیکھا، سرہانے چائے کا پاٹ رکھا ہے۔ میز پر صبح کے اخبار پڑے ہیں۔

تیار ہو کر آفس کے لئے نکل ہی رہا ہوں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھانے میں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

دوسری طرف اپنا وہی دوست ہے جس نے رات ہوٹل میں دعوت کا انتظام کیا تھا۔

رات دیر تک فون کرتا رہا، تمہارا فون کام نہیں کر رہا تھا، میرے دوست نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

معاف کرنا، میرا فون شام ہی سے ڈیڈ تھا، موسم کی خرابی سے اکثر ایسا ہوجاتا ہے، میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ تم بتاؤ، دعوت کیسی رہی۔ دوستوں کی صحبت پر لطف رہی نا۔

دعوت ہوئی کہاں۔ یہی بتانے کو تو بار بار فون کر رہا تھا۔ رمیش خراب موسم کی وجہ سے بودھ گیا سے نہیں لوٹ پایا۔ فون کر کے اس نے دعوت رد کرنے کی بات کہی۔ مجبوراً مجھے دعوت رد کرنی پڑی۔ مجھے تمام دوستوں سے معافی مانگنی پڑی۔ تم فون پر ملے ہی نہیں۔

کوئی بات نہیں۔ موسم واقعی بہت خراب تھا۔ دھند کی وجہ سے سڑکیں بھی صاف نہیں دِکھ رہی تھیں۔ فون ڈیڈ تھا، اس لئے تمہیں خبر نہیں کر سکا۔ میری شام تو یوں ہی کمرے میں پڑے پڑے گزر گئی۔

دوسرے تیسرے دن آسمان عام دنوں کی طرح صاف رہا۔ سڑکوں پر جمع پانی بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ سٹی بسیں وقت سے چلنے لگیں۔

کئی دن کی غیر حاضری کے بعد میں آفس پہنچا ہی تھا کہ ایک اسٹاف نے رمیش کا فون آنے کی خبر دی۔ میں نے کہہ دیا، آپ دفتر نہیں آئے ہیں، شاید گھر پر ہی ہوں۔ کہنے لگے، وہ گھر سے آفس کے لئے نکل چکے ہیں۔ آتے ہی مجھے فون کرنے کو کہنا۔

ہفتہ دن کے پنڈنگ کام نبٹانے میں مجھے رمیش کے فون کا خیال نہیں رہا۔ ممکن ہے، میں جان بوجھ کر ہی اسے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دو تین گھنٹے کے بعد، رمیش نے دوبارہ فون کیا بی دوست، میں آج بھر ہی شہر میں ہوں۔ کل سویرے دہلی نکلنا ہے۔ وہاں سے واپسی کا سفر۔ آج شام کو ہم کہیں مل سکتے ہیں؟ اس بار ملاقات نہیں ہوئی تو بہت افسوس رہے گا۔ میں کچھ خاص سوچ کر انڈیا آیا تھا۔

میں نے بہانہ بنانے کی کوشش کی بی یار، کام کا پریشر ہے۔ کئی دن کے بعد دفتر آیا ہوں۔ دیکھو، وقت نکالتا ہوں۔ تھوڑا ٹھہر کے فون کروں گا۔

اچانک مجھے یاد آیا، شہر میں ایک نئی فلم لگی ہے۔ آج پہلا دن ہے۔ کیوں نہ اسے آج ہی دیکھ آؤں۔ ساتھ جانے کو کوئی اور نہیں ملا تو دفتر سے حمید کو راضی کیا۔ یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ شام سے دیر رات تک رمیش کے فون سے نجات مل گئی۔ جب تک گھر لوٹوں گا، کافی دیر ہو چکی رہے گی۔

فلم تجربہ کے لحاظ سے اچھی تھی۔ کرداروں نے اپنے رول موثر انداز میں نبھائے تھے۔ موسیقی میں نرم احساس کا جادو تھا۔ عام فلموں کے مقابلے کچھ زیادہ طویل ہونے کے باوجود، فلم دیکھنے والوں کی دل چسپی بنی رہتی ہے۔ میری دل چسپی تو صرف وقت گزارنے میں ہے۔

موبائیل فون میں نے بند کر رکھا ہے۔ میرا

ذہن کسی طرح کے تردد سے خالی ہے۔

گھر لوٹا تو رمیش کے آنے کی خبر ملی۔ بیوی نے بتایا، کافی دیر انتظار کرکے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے، ضروری تھا ملنا۔ پتہ نہیں کہاں رہ گیا۔ فون پر بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید دفتر کے کام سے کہیں چلا گیا ہو۔ جاتے وقت ایک بند لفاف آپ کے لئے چھوڑ گئے۔ میں نے سنبھال کر آپ کی میز پر رکھ دیا ہے۔

خبر نے میرے دل میں کوئی تجسس نہیں پیدا کیا۔

گرم پانی سے نہانے کے بعد تھوڑا بہتر محسوس کیا۔ دن بھر کی تکان جاتی رہی۔ سر کا بھاری پن دور ہو گیا۔

بیوی نے کھانا پروسا تو میں نے ٹی وی پر دیر رات چلنے والا ایک شو آن کر دیا۔ نظر ٹی وی سکرین پر ٹکا دی، لیکن دماغ کسی اور دنیا میں الجھا رہا۔

ایک بار خیال آیا، رمیش کا دیا بند لفاف کھول کر دیکھ لوں۔ پتہ نہیں کیا لکھا ہے۔ آنکھیں سکرین پر جمی رہیں، یہاں تک کہ ان میں نیند کی پرچھائی اتر آئی۔

دوسرے دن دفتر میں چھٹی تھی۔ میں دیر تک سویا رہا۔ بیوی نے جگایا نہیں ہوتا تو شاید کچھ اور پہر بستر پر ہی گزر جاتے۔

چائے کے کتنے پیالے آئے اور گئے۔ دن کے گیارہ بجے ہوں گے جب میری نیند تھک کر ٹوٹ گئی۔

نہا دھو کر تیار ہوا تو چہرے پر سکون کی لکیریں لئے ناشتے کی میز پر پہنچا۔ پوستہ دانے کے پراٹھے اور ہری مرچ کی چٹنی۔

بے خیالی میں چٹنی زبان پر زیادہ چڑھ گئی تو 'سی' کی آواز ابھری۔

بیوی نے دھیمی آواز میں پوچھا، آپ نے رمیش کا لفاف کھولا نہیں۔ کہہ رہے تھے کہ ضروری کاغذات ہیں۔

رمیش نے آگے لکھا تھا 'میں نے پاپا کو بتانا چاہا، میرا جرم آپ سے کہیں بڑا ہے۔ میں نے اس کی بڑی محنت سے لکھی اوریجنل تھیسس چرالی تھی۔ ٹھیک اس وقت جب وہ اسے ڈگری کے لئے یونی ورسٹی میں جمع کرنے کو تھا۔ میں اپنا جرم پاپا کے سامنے ظاہر نہیں کر سکا۔ میں آخری وقت میں ان کی تکلیف بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ آج میں تمہیں وہ تھیسس لوٹا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تم مجھے معاف نہیں کروگے، ہرگز نہیں کروگے۔

دیکھ لوں گا، ایسی جلدی کیا ہے۔ دیس بدیس کے قصے ہوں گے۔ کچھ تصویریں ہوں گی، اور کیا۔ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

چائے پی کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میز پر رمیش کا لفاف رکھا تھا۔ اچھی طرح سیل کیا ہوا۔ اوپر اس کی تحریر میں اپنا نام نظر آیا۔ لفاف بڑا تھا،

چائے پی کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میز پر رمیش کا لفاف رکھا تھا۔ اچھی طرح سیل کیا ہوا۔ اوپر اس کی تحریر میں اپنا نام نظر آیا۔ لفاف بڑا تھا، بھاری بھی تھا۔ میں نے سنبھال کر قینچی کے سہارے کھولا۔ سب سے اوپر رمیش کا خط تھا۔ کچھ سطریں اس طرح تھیں، 'شاید ہماری ملاقات نہیں ہو، اس لئے یہ لفاف چھوڑے جا رہا ہوں۔ پاپا نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا، میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ ہے۔

بھاری بھی تھا۔ میں نے سنبھال کر قینچی کے سہارے کھولا۔ سب سے اوپر رمیش کا خط تھا۔ کچھ سطریں اس طرح تھیں۔

'شاید ہماری ملاقات نہیں ہو، اس لئے یہ لفاف چھوڑے جا رہا ہوں۔ پاپا نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا، میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ ہے۔ میں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرکے امتحان میں تمہارے نمبر بڑھوا لئے تھے۔ یہ سوچ کر میرا دل اکثر بے چین ہو جاتا ہے۔ میں تمہارے دوست سے مل کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ لیکن اندر سے ہمت نہیں ساتھ دیتی۔'

رمیش نے آگے لکھا تھا 'میں نے پاپا کو بتانا چاہا، میرا جرم آپ سے کہیں بڑا ہے۔ میں نے اس کی بڑی محنت سے لکھی اوریجنل تھیسس چرالی تھی۔ ٹھیک اس وقت جب وہ اسے ڈگری کے لئے یونیورسٹی میں جمع کرنے کو تھا۔ میں اپنا جرم پاپا کے سامنے ظاہر نہیں کر سکا۔

میں آخری وقت میں ان کی تکلیف بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ آج میں تمہیں وہ تھیسس لوٹا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تم مجھے معاف نہیں کروگے، ہرگز نہیں کروگے۔ لیکن میں اور زیادہ دن اس راز کو اپنے سینے میں دبا کر نہیں رکھ سکتا۔'

خط کے نیچے، کلپ سے دبی، ہارٹ کرین پر لکھی میری تھیسس کا اوریجنل ٹائپ شدہ مسودہ رکھا تھا۔

مسودے میں، جگہ جگہ، میرے گائیڈ کے خوبصورت ریمارکس درج تھے۔ ان کے دستخط بھی تھے۔

میں بھاگتا ہوا فون کے پاس گیا۔ رمیش جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا، اس کے نمبر ملائے

منیجر نے جواب دیا۔ سر، وہ صبح پانچ بجے ہی چیک آؤٹ کر گئے۔ ان کی فلائٹ چھ بجے تھی۔

میز پر رکھا مسودہ کرچیوں کی طرح آج بھی میری آنکھوں میں چبھ رہا ہے!

□□□

کوکھ کی تلاش

ترنم جہاں شبنم
ذاکر نگر، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵
موبائل: 9266860756

''ارے ساب یہ لاسیں کیا ہیں؟ یہ تو ماس کے ٹکرے ہیں ٹکرے وہ بھی ایسے کہ جیسے کسائی کی دکان سے لا کر یہاں پھینکے گئے ہوں۔ اور ساب سارے کے سارے چھوریاں لوگوں کے ہیں، اس میں چھورا تو ایک ناہی۔ لاسوں کے نام پر یہ تو کچڑا ہے کچڑا لونڈیوں کا''۔

بھیڑ سے گھرے ایک گڈھے میں اترے سپاہی نے یہ کہتے ہوئے اپنے افسر کو اطلاع دی۔

یہ سنتے ہی صحافی حضرات نے بھی ایک بار پھر بھیڑ کو چیرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی اپنا کیمرہ اور بیگ سنبھالتے ہوئے اُس گڈھے کے اوپر آ گھڑا ہوا اور ایک کے بعد ایک تصاویر اتارنے لگا۔ خون اور گوشت کے ان لوتھڑوں کی تصویر اتارتے ہوئے اور وہاں کا وہ منظر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے سرخی مائل اندھیرا پھیل گیا جس سے دماغ چکرانے لگا اور اسے لگنے لگا کہ اب وہ خود سے اپنا قابو کھو دے گا۔ کیونکہ گڈھے میں موجود لاشوں کے نام پر واقعی ادھورے وجود میں لڑکیوں کا کچرا ہی تھا۔

کچھ دیر پہلے جب کسی نے گاؤں میں کچھ بچوں کی لاشیں ملنے کی خبر دی تھی۔ تب وہ ایک عام صحافی کی طرح خبر کی جانب بھاگا تھا۔ راستے بھر خبر کے تعلق سے بہت سی باتیں اس کے دماغ میں گھومتی بھی رہی تھیں کہ معصوم بچوں سے کسی کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟ ان معصوموں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اور بھلا انہیں کوئی کیوں مارے گا؟

پھر اس نے خود ہی یہ سوچا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ اُن کے والدین کی کسی سے کوئی رنجش رہی ہو۔ جس کا بدلا دشمنوں نے ان کی اولاد سے نکالا ہے۔ مگر یہاں حالات کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔

صحافی حضرات افسران سے اس خبر کی بابت تفصیلی جانکاری حاصل کرنے میں لگے تھے۔

کچھ دیر پہلے جب کسی نے گاؤں میں کچھ بچوں کی لاشیں ملنے کی خبر دی تھی۔ تب وہ ایک عام صحافی کی طرح خبر کی جانب بھاگا تھا۔ راستے بھر خبر کے تعلق سے بہت سی باتیں اس کے دماغ میں گھومتی بھی رہی تھیں کہ معصوم بچوں سے کسی کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟ ان معصوموں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اور بھلا انہیں کوئی کیوں مارے گا؟ پھر اس نے خود ہی یہ سوچا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ اُن کے والدین کی کسی سے کوئی رنجش رہی ہو۔

افسران کا ماننا تھا کہ گڑھے سے برآمد شدہ گوشت کے لوتھڑے اُن بچیوں کے ہیں جنہیں ان کی پیدائش کے مقرر وقت سے قبل جنس کی جانچ کے بعد ماں کے رحم میں ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ شاید بیٹی ہونے کے ناتے انہیں دنیا میں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ان کی وہ ادھوری سانسیں ماں کے رحم میں ہی توڑ کر ان کے مردہ وجود کو کچرے کی شکل میں اس گڈھے میں لا کر ڈال دیا گیا تھا۔

اُن لوتھڑوں کی تصویریں اتارتے ہوئے وہ اُس بے نام سی کیفیت کی زد میں آتا جا رہا تھا جس سے وہ خوفزدہ رہتا تھا۔ اِس وقت بھی وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ یہاں کوئی عجیب وغریب حرکت نہ کر بیٹھے۔

ذہن بٹانے کے لئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر ہر طرف اُسے زار وقطار روتی چیختی ان بچیوں کا شور ہی سنائی دے رہا تھا۔

ایسا شور جو اس کے کان کے پردے پھاڑتا ہوا اُسے الجھاتا ہوا اُس کے دماغ پر چوٹ کر رہا تھا۔

ایسا شور جو چیختی ہوئی بچیوں کے کرب اور آہوں کا احساس کرا رہا تھا۔

ایسا شور جو اس کے وجود میں لرزش پیدا کر رہا تھا۔

ایسا شور جو اس کے احساس کو جھنجھوڑ کر شعور کو بیدار کر رہا تھا۔ جو اسے اس کے وجود کی اہمیت بتاتے ہوئے آنے والے کل میں اس کے وجود کے لئے سوالیہ نشان بھی بنا رہا تھا۔

افسران کا بیان رکارڈ کرتے ہوئے وہ اُس ماحول اور اپنے اندر کے شور سے پریشان تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی گلا دبا رہا ہے اور دم بس نکلنے ہی والا ہے۔ گھٹن اور خوف سے ایک چیخ اس کے اندر بلند ہوئی۔'' میری ماں مجھے بچالے۔۔۔''

اُس کی اس پکار کے ساتھ زار وقطار روتی چیختی

ان بچیوں نے اور تیز آواز کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ شور اب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

بمشکل تمام خود کو سنبھالتے ہوئے وہ ایک پتھر پر جا بیٹھا اور سختی سے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے تا کہ شور سنائی نہ دے مگر تب تک شور اس کے کان کے پردوں کو چیر کر دماغ سے ٹکراتا ہوا آنکھوں کے سامنے منظر بنانے لگا تھا۔

اُس نے دیکھا گھبرائی ہوئی ایک حاملہ عورت ''بچاؤ بچاؤ'' کہتی ہوئی اپنا پیٹ پکڑے اِدھر، اُدھر بھاگ رہی ہے اور ہر بار اُس کے پاس سے ''بچاؤ، بچاؤ'' کی دو آوازیں سنائی پڑتی ہیں۔ ایک آواز اس عورت کی ہے اور دوسری اس کے رحم میں پل رہی ایک معصوم بچی کی ہے۔ کچھ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ یہ کہتے ہوئے اس کے پیچھے ہے۔

''ارے کل موہی ہمیں ونش چلانے والا چاہئے اس مہنگائی میں کہاں کھپائے گے اسے، چل ختم کر اس جھگڑے کو۔۔۔۔۔۔'' تب ''بچاؤ بچاؤ'' کہتی اپنا پیٹ پکڑے بھاگتی وہ عورت اپنے بچاؤ کے لئے دوسری سمت دوڑتی ہے۔

وہاں اسے سفید اپرن پہنے کچھ اور عورتیں اور مرد نظر آتے ہیں جن کے درمیان پہنچ کر وہ کچھ مطمئن نظر آتی ہے اور ان کے ساتھ چل دیتی ہے۔ مگر وہ سب بھی اسے ایک ایسے کمرے میں لے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے قسائی والے چھرے ہاتھ میں لئے اپرن پہنے کچھ اور لوگ موجود ہیں۔ وہ سب بھی اس کے رحم میں پل رہی بیٹی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہاں وہ اکیلی نہیں ہے وہاں اُس جیسی اور عورتیں بھی موجود ہیں اور ان سب کے اندر سے بھی التجا کرتی ہوئی معصوم بچیوں کی پکار سنائی دے رہی ہے۔

''ہمیں مت ماریئے، ہمیں جنم لینے دیجے، ہم بھی دنیا دیکھنا چاہتے ہیں، ہمیں بھی دنیا میں آنے دیجیے۔''

لیکن اپرن پہنے وہ لوگ اس شور سے بے خبر ایکدم شانت ہیں۔ کمرے کے باہر لگے اُس پوسٹر کی مانند جس میں منہ پر انگلی رکھ کر ''ش ش ش ششششش'' کہتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا گیا ہے۔

وہیں اس کی برابر میں لگے کچھ اور پوسٹر بڑے

شرمندہ سے نظر آ رہے ہیں۔ جس میں ایک پر لکھا ہے۔

''بھرون ہتیہ پاپ ہے۔''

اور دوسرے پر لکھا ہے۔

''بچّے کے جنم سے پورولنگ کی جانچ قانوناً اپرادھ ہے''۔

گھبرا کر اس نے کانوں کے ساتھ ساتھ اب آنکھیں بھی سختی سے بند کر لیں۔ مگر نہ شور کم ہوا نہ منظر آنکھوں کے سامنے سے گئے۔ ذہن پہلے سے زیادہ چکرانے لگا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جس زمین پر وہ بیٹھا ہے اُس جگہ کا وزن پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے زمین کا توازن بگڑ رہا ہے۔ زمین نیچے کو دھسنے لگی ہے اور وہ بھی آہستہ، آہستہ زمین کے ساتھ اندر کو دھنستا جا رہا ہے۔ پھر زمین ایک ایسی جگہ جا کر رُک جاتی ہے جہاں صرف مرد ہی مرد ہیں۔ بے نور اور بے رونق جگہ ہے جہاں کائنات کی پری عورت کا نام و نشاں تک نہیں ہے۔ مرد اپنے ادھورے پن سے پریشان ہو کر خونخوار ہو چکے ہیں اور ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں۔

تمام ہی منظر اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں بدحواسی کے عالم میں غش کھا کر وہ پیچھے کو گرتا ہے۔ مگر اب وہ جہاں ہے وہاں کا منظر اس کی اُمید سے بھی زیادہ خوفزدہ کر دینے والا ہے۔ یہاں اُن بچیوں کے شور سے زیادہ بھیانک مردانہ شور ہے اور وہ شور ہے اُن مرد بچوں کی ارواحوں کا جو اس دنیا میں آنا چاہتی ہیں مگر انہیں جنم دینے والی ایک کوکھ انہیں نصیب نہیں ہے۔

اُن بچوں کی وہ روحیں بھی بچیوں کی روحوں کی ہی مانند چیخ چیخ یہ کر کہہ رہی ہیں۔ ''ہم بھی دنیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی دنیا میں آنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی جنم دینے والی ایک کوکھ چاہیے۔ ایک ماں چاہیے۔ ہمیں ایک کوکھ دو ایک ماں دو۔۔۔۔۔''

نعرے لگاتی مرد بچوں کی ارواحوں کے اس شور سے پریشان ہو کر اس کی ایسی دلخراش چیخ بلند ہوئی کہ زمین و آسمان لرز گئے۔ شور کرتے بچوں کی ارواحیں سہم کر اُس کے اُس جملے میں الجھ گئیں جو پوری طاقت سے چیختے ہوئے یہ کہہ رہا تھا۔ ''یا اللہ اب کیا آدم ذات کی پسلی سے یک بار پھر۔۔۔۔۔۔؟''

❑❑❑

کہانی ایک مصور کی

ڈاکٹر عبیداللہ چودھری
313، بسنت پور، گورکھپور
موبائل: 8574986978

اشوک کو کشمیر کی سرزمین پر آئے ہوئے آج ایک ہفتے سے زائد ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی پیشانی پر خطۂ کشمیر ایک تاج کی مانند لگتا ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے خطۂ کشمیر جنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے ہرے بھرے کھیت، مہکتے پھول، دلکش وادیاں، مناظر قدرت کی کرشمہ سازی کا حسین منظر فراہم کرتے ہیں۔ کئی دن سے اشوک کشمیر کے خوبصورت شہر گل مرگ کے ایک عالیشان ہوٹل میں مقیم ہے۔ آج وہ برف باری کی وجہ سے کمرے سے نہ نکل سکا۔ اس نے خود کو کمرے میں قید کر لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بخاری جلائے، اپنے جسم کو کمبل سے لپٹائے برف باری کے حسین و پر کیف مناظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کی دلکشی کو محسوس کر رہا ہے۔ کشمیر میں پہلی برف باری کا سماں ہے بیحد حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ اس دلکش منظر کی خوبصورتی و رعنائی ہر فنکار اپنے اعتبار سے اس کی عکاسی کرتا ہے۔

اشوک ایک شہرت یافتہ مصور ہے جس نے کشمیر کی خوبصورت وادیوں کی عکاسی اپنے رنگوں کی زبان میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کینوس پر جھرنوں کے مناظر کو دیکھ کر اس کی موسیقیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی تصویر دہلی کی نمائش میں پینٹنگ کے مقابلے میں اول آئی ہے۔ اس نمائش میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے آرٹسٹ جمع ہوئے تھے جنہوں نے اپنی مصوری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسی نمائش میں اشوک کو یہ اطلاع ملی کہ کشمیر میں گل مرگ کے مقام پر ایک ایسا آرٹسٹ رہتا ہے جو چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسانوں کی تصویریں اس انداز سے بناتا ہے کہ دیکھنے والے حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ان تصویروں میں روح پھونک دی جائے تو وہ بول پڑیں گی۔ ہندوستان کے دیگر حصوں سے سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہوئے مقامی اور بیرونی سیاح اس مصور سے اپنی تصویریں بنواتے ہیں اور اس کے عوض منھ مانگی قیمت ملتی ہے تاہم وہ آرٹسٹ کسی بھی مقابلے میں اپنی بنائی ہوئی تصویریں نہیں بھیجتا اور خود گمنامی کی قید میں رہنا ہی بہتر تصور کرتا ہے۔ اشوک کو اسی مصور سے ملنے کی خواہش نے بے چین کر رکھا تھا اور اسی کے پیش نظر اسے یہاں آنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اشوک نے گل مرگ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہونے کے بعد ہی اس مصور کے بارے میں معلومات فراہم کر لی ہے۔ گل مرگ کی صبح سفید روشنی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اشوک نے اپنے کمرے کے دریچوں کے پردے سرکا کر اس کی خوبصورتی کو آنکھوں میں اتار کر اپنی روح کو سرشار کیا اور مصور سے ملنے ہوٹل سے نکل پڑا۔ مصور کی رہائش کا اسے علم ہو چکا تھا۔ اس کا چھوٹا سا خوبصورت کاٹج ہوٹل کی بالائی منزل سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اشوک مصور کے کاٹج تک پہنچ جاتا ہے۔ دروازے پر دستک کی کھٹ کھٹ کی آواز.....

'کون ہے؟'

'میں ایک سیاح ہوں۔ میرا نام اشوک ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت دور سے آیا ہوں۔'

مصور دروازہ کھولتا ہے۔ اشوک کو اندر آنے اجازت دے کر ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے اور پوچھتا ہے: ''کیا تمہیں اپنی تصویر بنوانی ہے؟'

'نہیں! میں خود ایک آرٹسٹ ہوں، میرا نام اشوک ہے۔ میری بنائی ہوئی تصویر اس سال کے پینٹنگ کے مقابلہ میں اول قرار دی گئی ہے۔ دہلی کی نمائش میں چند لوگوں سے آپ کی پینٹنگ کے بارے میں سنا اور آپ سے ملنے کی خواہش نے خاص طور سے یہاں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں آپ کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں۔' مصور اشوک کو اپنے پینٹنگ روم میں لے گیا جہاں پر انسانی تصویریں سلیقے کے ساتھ دیوار پر آویزاں تھیں۔ تصاویر اس حد تک جاذب نظر تھیں کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ سبھی تصویریں ابھی بولنا شروع کر دیں گی۔ اتنی خوبصورت تصویریں اشوک نے آج سے پہلے نہیں دیکھی تھیں اور وہ ان تصویروں کو فن مصوری کی معراج تصور کرنے لگا۔

'پسند آئی تصویریں؟' مصور کی آواز نے اشوک کے مزید سوچنے کے سلسلہ کو توڑ دیا۔

'جی جی! بہت، یہ تصویریں نہیں ہیں بلکہ ایک آرٹسٹ کے فن کی روح ہے۔ شائد آپ کو معلوم نہیں۔ یہ تصویریں مصورانہ فنکاری کی شان ہیں۔ دولت و شہرت آپ کے قدم چومنے کو بیتاب ہیں لیکن نہ جانے کیوں آپ غریبی کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے خوشنما چہرے پر یہ مایوسی کے عنصر کیوں غالب ہیں؟ مایوسی ایک ایسی شئے ہے جو

انسان کے جسم وروح کی حلاوت چھین کر اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو سرد کر دیتی ہے۔'

'کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ خود کو اس مصوری کے فن سے کب سے جوڑے ہوئے ہیں؟ کیا آپ اکیلے ہیں.....؟'

'ہاں، میں اکیلا ہوں اور تقریباً ۲۰ ربرسوں سے میں اس فن سے جڑا ہوا ہوں۔ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں، نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی اور نہ بیوی۔ میرا کوئی شریک غم نہیں، میرے دوست، میری تنہائی اور میرا فن ہے اور یہی فن میری حیات کا حاصل ہے۔ میری زندگی کے مضراب کا تار ہے۔ میری تخلیقی تصویریں ہی میرے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ جن انسانوں کی یہ تصویریں ہیں جنہیں دیکھ کر تم یہ محسوس کرتے ہوگے کہ یہ ابھی بول پڑیں گی، ان کی طرف ذرا غور سے دیکھو تو ان کے چہروں پر ان کے دلوں کا عکس بھی صاف نظر آنے لگے گا۔ یہی چہرے ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ چہرے اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ ان کے دلوں میں کوئی بوجھ ہے؟ کوئی درد ہے؟ کوئی کسک ہے؟ کوئی بے قراری ہے؟ یہ باتیں ان کی زبانیں کہنے سے قاصر ہیں تاہم دل سے محسوس کرتے ہیں، انہیں احساسات کو میں خوبصورت رنگوں کے الفاظ دے کر اجاگر کرتا ہوں اور یہی مصورانہ فنکاری کی معراج بن جاتے ہیں۔'

'کیا آپ مجھے بھی انسانی احساسات کی تصویر کشی کرنے کا فن سکھا سکتے ہیں؟ جس کی مدد سے میں بھی انسانی احساسات کو ان کے چہروں کو پڑھ کر ان کے دلوں کا حال خوبصورت رنگوں کی مدد سے کینوس پر اتار سکوں؟'

'نہیں، نہیں، یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے تمہیں میری طرح زندگی کی ناکامیوں اور تلخیوں کا سارا زہر اپنے خون میں اتارنا پڑے گا اور جب تک زندہ رہنا ہوگا، اپنے وجود کی لاش خود اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانا ہوگی کیونکہ میرے سینے میں ایک بوجھ ہے اور یہ بوجھ جب بھی میں محسوس کرتا ہوں، میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، ڈرتا ہوں کہیں اس بوجھ سے ایک دن میرے دل کی دھڑکنیں اچانک رک ہی نہ جائیں۔ اچھا اب تم جاسکتے ہو اور ہاں اب تم مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کرو بہتر ہے۔'

مصور کی باتیں اشوک کے دل ودماغ میں گھر کر گئی ہیں۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ مصورانہ فنکاری کے میدان میں وہ انسان اپنی مثال آپ ہے، اسے کوئی غم ضرور ہے جس کو وہ چھپانے کی ناکام کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کی زبان تو خاموش رہتی ہے لیکن اس کی نظریں بہت کچھ عیاں کر دیتی ہیں۔

اشوک نے گلمرگ میں ایک عشرہ گزارنے کے بعد واپسی کا پروگرام بنایا ہے۔ وہ سری نگر ہوتا ہوا واپس دہلی جانا چاہتا ہے۔ کشمیر کی حسین وادی اور پرکیف فضاؤں کو چھوڑنے سے پہلے وہ ایک بار پھر سے مصور سے ملنے کے ارادے سے ہوٹل سے نکلتا ہے جیسے ہی وہ کاٹج کی شاہراہ پر قدم رکھتا ہے، کیا دیکھتا ہے کہ کاٹج میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کاٹج کی لکڑیوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر اس نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا ہے۔ جلتے ہوئے کاٹج کے اردگرد قرب وجوار کے بہت سے لوگ جمع ہیں اور آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اشوک کچھ لوگوں کی مدد سے کاٹج کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ وہ کسی طرح مصور کو شعلوں کی زد سے نکالنا چاہتا ہے۔ اندر جا کر دیکھتا ہے کہ دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ وہ سرعت سے آگے بڑھتا ہے، جلتی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر وہ محسوس کرتا ہے کہ آج ان بولتی ہوئی تصویروں کا آخری دن ہے۔ دفعتہ اس کی نظر پلنگ کے قریب مصور پر پڑتی ہے۔ اس کے جسم کے کچھ حصے جلتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ وہ خود کو آگ سے بچانے کے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ اشوک مصور کو آگ کی لپٹوں سے بچا کر باہر لے آتا ہے۔ مصور کے جسم کے کچھ حصے جھلس چکے ہیں۔ وہ التجا آمیز نظروں سے اشوک کو دیکھتا ہے لیکن آواز خاموش ہوچکی ہے۔ روح عالم بالا میں پرواز کر چکی ہے۔ اشوک مصور کے سینے سے چپکی ہوئی تصویر نکالتا ہے۔ یہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی ہے جس کی آنکھوں میں دو بوند آنسو پنہاں ہیں جو ڈھلنے کو بیتاب ہیں۔ تصویر کا رنگ آج بھی تازہ و شگفتہ کھلے ہوئے پھول کی مانند ہے۔ حیرت ہے یہ تصویر پوری طرح شعلوں کی زد سے محفوظ ہے۔ تصویر کے بارے میں اشوک نے مقامی لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تصویر والی لڑکی مصور کی محبوبہ تھی جو دس سال قبل اس جہان فانی سے کوچ کر چکی ہے۔ اشوک پر یہ راز کھل گیا کہ مصور کو مصوری کے فن میں معراج کمال تک پہنچانے والی کون سی طاقت تھی۔ وہ کون سی تڑپ تھی جس سے اس کے فن کو تحریک ملتی رہی۔

عورت کا وجود قدرت کا گراں عطیہ ہے جو انسان کے دل و دماغ کو معطر کرتا ہے۔ مصوری، شاعری، افسانہ نگاری انسان کے شعوری وجدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر فنکار اس کے تعلق کو قصداً دور رکھنا بھی چاہے تو بھی وہ عملی زندگی میں ذہنی یا جسمانی طور سے عورت کے بیحد قریب رہتا ہے۔

مصور کا پر درد ماضی جو حال کے سینے میں لوہے کی سیخ کے مانند گڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے جسم کا خون نچوڑ کر اپنی فنکاری کو جلا بخشتا رہا۔ اشوک کو مصور سے کئے ہوئے بہت سے سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔ اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوچکی ہے کہ زخم بھر جائیں، گھاؤ مٹ جائیں لیکن ان زخموں کے نشان کبھی نہیں مٹتے اور انہیں نشانوں سے زخموں کے آزار کی تلخ یادیں ہمیشہ جڑی رہتی ہیں۔ مصور کو بھی اس کی یادوں نے بے چین رکھا۔ وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی ہمیشہ تنہا ہی رہا..... بالکل تنہا.....

❑❑❑

فرنگی محل اور ندوۃ العلماء

مرزا جعفر حسین
۱۸۹۹ ۱۹۸۹

شہر لکھنؤ کو اس بارے میں بھی بجا طور پر فخر و ناز ہے کہ علوم مشرقیہ کی ترویج سارے ملک میں اسی سرزمین سے ہوئی تھی۔ قدیم ترین عہد میں مختلف مقامات پر علوم شرقیہ و درسیہ کے لئے تعلیم کا سلسلہ تھا اور مدرسے قائم تھے جن میں دیوا، گھورکھپور، جائس اور بنارس کی درسگاہیں شہرت کی مالک تھیں لیکن یہ خصوصیت صرف اسی شہر کو حاصل ہو سکی کہ یہاں اتنی بلند پایہ درسگاہ قائم ہوئی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی مقتدر اور مستند قرار پائی۔ اس تعلیمی ادارے کو دنیا میں پہلی علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی کہنا یقیناً صحیح ہوگا۔ یہ آج بھی اپنی اصلی مقام پر اور ایک حد تک اپنے پرانی روایات سمیت فرنگی محل کے نام سے قائم ہے اور اس کا وقار بڑی حد تک اب بھی برقرار ہے۔ لہٰذا فرنگی محل کی پرانی تاریخ اور اس کی وجہ تسمیہ پر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عہد اکبر بادشاہ میں موجودہ لکھنؤ کی آبادکاری شروع ہو چکی تھی اور یہ شہر تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک فرانسیسی تاجر یہاں آیا تھا اور حکومت مغلیہ سے پروانۂ اقامت حاصل کر کے چوک سے متصل قیام کیا تھا۔ وہ گھوڑوں کا تاجر تھا اور بہت جگہ اس تجارت میں اس نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ غالباً تین چار مکانات ملحق بیک دیگرے کوٹھی نما شکل میں تیار کرا کے اسی نام سے اس کی کوٹھی موسوم ہو گئی تھی۔ بہرحال یہ نام صدیوں سے برقرار ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب اس تاجر کا پروانۂ مستامنی تجدید نہ ہو سکا اور اس کو اپنے وطن واپس ہونا پڑا تو یہ عمارات بحق سرکار ضبط ہو گئیں۔ عہد اورنگ زیب میں جب بارہ بنکی کے قصبہ پیتی پور والے عثمانی شیخ زادوں نے مناقشات کی بنا پر ملحقہ قصبہ سہالی کے ممتاز عالم اور مقتدر صوفی بزرگ ملا قطب الدین انصاری کے مکان پر چڑھائی کر کے ان کو قتل کر دیا تھا تو اس برگزیدہ خاندان کے لئے اپنے وطن میں قیام کرنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ ملا صاحب کے منجھلے صاحبزادے ملا سعید نے دکن جا کر اورنگ زیب کو جو اس وقت وہاں برسرکارزار تھا، ایک محضر پیش کیا تھا جس کو شرف قبول حاصل ہوا۔ بادشاہ نے یکے بعد دیگرے دو فرامین جاری کئے۔ پہلا فرمان قطب الدین انصاری کے خون ناحق کا قصاص لینے سے متعلق تھا اور دوسرے فرمان میں ان کے خاندان کو لکھنؤ میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دی گئی تھی اور یہی چاروں مکانات موسومۂ فرنگی محل اقامت کے لئے مرحمت ہوئے تھے۔ بعد میں بعض اور ملحقہ عمارتیں شامل ہوتی گئیں یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا محلہ فرنگی محل کے نام سے آباد ہو گیا۔ یہ پورا علاقہ علمائے فرنگی محل کی اقامت ہے اور اسی دائرہ میں وہ مہتمم بالشان درسگاہ قائم ہوئی تھی جس کے بانی ملا نظام الدین خلف ملا قطب الدین انصاری تھے۔ ان کے اخلاف اب بھی فرنگی محل میں آباد ہیں اور انصاری کے لقب سے ممتاز ہیں۔

ملا قطب الدین کے چار صاحبزادے تھے جن میں منجھلے نظام الدین تھے جو بعد میں ملا نظام الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے دوسرے تین بھائی درس و تدریس میں کمال رکھتے تھے اور ان کی مختلف

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جوجھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی پانچویں کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' سے ایک تحریر 'فرنگی محل اور ندوۃ العلماء' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

شاخوں میں بعض جید عالم اور گراں قدر صوفی گزرے ہیں لیکن ملا نظام الدین کا نام نامی زندۂ جاوید ہے۔ آپ کی عمر اپنے والد مرحوم کی ہلاکت کے وقت صرف چودہ برس کی تھی لیکن آپ اس وقت شرح ملا جامی ختم کر چکے تھے۔ دل میں ذوق علم اور سر میں تکمیل کا سودا تھا۔ آپ نے دیوا، بنارس اور جائس جا کر بڑے بڑے علماء کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور بالآخر لکھنؤ آ کر ملا غلام علی نقشبندی سے درس لے کر مدارج تکمیل پر فائز ہوئے۔ علم و فضل کی برکتوں نے آپ کے دل میں تصوف کا بھی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ چالیس برس کی عمر میں آپ نے شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ اسی وقت سے منقولات کے ساتھ معقولات پر بھی زور دیتے رہے تھے۔ تدریس کے ساتھ آپ کو فطری تعلق تھا۔ اسی صلاحیت کی بدولت آپ نے ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب فرمایا جو شہرۂ آفاق ہوا۔ آج بھی اس کی افادیت تسلیم ہے اور نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نصاب میں آپ نے صرف ونحو، منطق وحکمت، فقہ واصول فقہ، علم تفسیر وحدیث، علم کلام اور علم ریاضی سے متعلق مخصوص کتابیں شامل کر دی تھیں جن کی تعلیم بہترین علماء وفضلا سے متعلق تھیں۔ جن کے نام نامی آج بھی باعث برکت ومفاخرت ہیں۔

عہد آصف الدولہ میں، جب انہوں نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہ شہر ایک نئی تہذیب کا مرکز بن گیا تھا، فرنگی محل کی کارآمد اور کامیاب زندگی کو پچھتر برس گزر چکے تھے۔ اس درمیان اس تعلیم گاہ کے مدرسین مسلم ممالک میں بڑی بڑی شہرتوں کے مالک ہو چکے تھے اور یہاں کے فارغ التحصیل طلباء ملک کے گوشوں گوشوں میں علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ اودھ کے فرمانروا عقیدتاً شیعہ تھے لیکن وسیع النظر بھی تھے۔ پاسداری اور رواداری ان کا مسلک تھا۔ علم دوست اور مخیر بھی تھے۔ فرنگی محل کی قدرشناسی کرتے ہوئے انہوں نے اس ادارے کے بیشتر علمائے اہل سنت کو مسند قضاوت و افتا پر مامور بھی کیا تھا۔ لیکن کسی مورخ یا واقعہ نگار کی زبانی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اودھ کے کسی بادشاہ نے بھی فرنگی محل کی کبھی کوئی نمایاں سرپرستی کی ہو۔ اسی طرح دلی کے دربار مغلیہ سے بھی اورنگ زیب کے دو متذکرہ بالا فرامین کے بعد فرنگی محل کے حق میں کسی دادو دہش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس موقر تعلیمی ادارے نے اپنی صلاحیت و افادیت نیز ملا نظام الدین کی خلوص نیت کے بل بوتے پر معراج ترقی طے کئے تھے۔

اس گرانقدر درس گاہ میں ابتدا ہی سے صرف ونحو، معانی و بیان، شعر وادب، عروض عربی، علم ہیئت، فقہ و اصول فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، الٰہیات، طبیعات وغیرہ کے درس ہوتے تھے۔ مدرسین میں مولوی ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ اور مولوی نعمت اللہ تعلیم وتدریس میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور مولوی عبدالحکیم، مولوی عبدالحی، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعداللہ، مولوی تراب علی، مولوی واجد علی، معقولات ومنقولات میں اکمل افراد سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں شیعہ ہوں یا سنی، ہر عقیدہ رکھنے والے اسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور تعلیم کا طرز انتہائی منصفانہ اور روادارانہ تھا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ منبع شیعیت مولوی سید دلدار علی الملقب بہ غفران مآب نے اسی جامعہ میں تکمیل علم فرمائی تھی نیز راقم الحروف کے مورث اعلیٰ تفضّل حسین خاں نے جو بزرگوں کے وقت سے سنی العقیدہ تھے، اسی درسگاہ میں زانوئے ادب تہہ کئے تھے لیکن جب وہ فارغ التحصیل ہوکر باہر آئے تو عقیدہ بدل چکے تھے۔ اس کے بعد سے وہ ہمیشہ شیعہ رہے اور ان کے اخلاف سب کے سب شیعہ تھے۔ فرنگی محل کی تعلیم وتدریس میں اسی منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور روادارانہ روش کی وجہ سے یہ ادارہ ہمیشہ ہندوستان نیز بیرونی ممالک کے عام مسلمانوں میں مقبول اور محترم رہا تھا۔ اسی ہر دلعزیزی نے اس کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کے زلزلہ افگن حالات بھی ان کو متزلزل نہیں کر سکے اور آج بھی اپنی زوال پذیر حالت میں یہ ادارہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کے زمانے تک فرنگی محل کی عظمت بڑی حد تک اپنے شباب پر تھی۔ یہاں بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ درس دینے والوں میں ثقہ بھی تھے، فقیہ بھی، صوفی بھی تھے، ماہر علم حدیث بھی، مفتی بھی تھے اور مولوی بھی لیکن خصوصیت کے ساتھ فرنگی محل کا وہ ہمہ گیر فکر ونظر کا ماحول قابل ذکر ہے جس نے بدلتے ہوئے حالات میں بھی مولانا عبدالباری کا سا رہبر ورہنما مسلمانوں کو فراہم کیا تھا جن کی ذہانت کو وقت کی الجھنوں اور گتھیوں کو سمجھ لینے اور ان کو سلجھانے کی تدبیریں پیش کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کی چشم بصیرت نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ آنے والے دور میں مسلمانوں کے حق میں سیاسیات سے بیگانہ رہنا ان کے حق میں خودکشی کے برابر ہوگا۔ انہوں نے خود بھی تحریک خلافت میں کچھ اس طرح حصہ لیا کہ مہاتما گاندھی کے ایسے سیاستداں کو بھی ان کی قدرشناسی کرنا پڑی۔ ہمارے احاطۂ تحریر سے سیاسیات کو کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ہم صرف اتنا اور کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ مولانا عبدالباری ہی کی فیض تربیت کا نتیجہ ہے کہ وطن پرور مسلمانوں کی صف اول میں فرنگی محل کی دو جلیل القدر ہستیوں مفتی رضا انصاری اور حیات اللہ انصاری کو مقام حاصل ہے۔

ندوۃ العلماء

علوم مشرقیہ کی تعلیم کے لئے فرنگی محل ایک مقتدر ایشیائی یونیورسٹی کی حیثیت ضرور رکھتا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں ایک نیا مکتب فکر معرض وجود میں آ گیا تھا جس کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ 'اپنے عقیدہ کو عزیز رکھو لیکن مغربی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاؤ' یعنی یہ کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔ (حیات شبلی، ص ۹۰)

ظاہر ہے کہ علمائے فرنگی محل مغربی تہذیب کے دلدادہ نہیں ہوسکتے تھے اس لئے اس نظریہ کی ترویج کے لئے علیٰحدہ مرکز ضروری تھا۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ اسی دوران بعض مقتدر علمائے دین کا شغف علوم تفسیر، حدیث اور رجال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ ان علوم کے پرانے طرزِ تعمیر سے کسی قدر برگشتہ بھی ہورہے تھے۔ سرسید کے مکتب فکر کا سایہ پڑا تو ان علماء کے رجحانات بھی تیزی سے آگے بڑھے اور ایک قلیل مدت کی جدوجہد کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء معرض وجود میں آ گیا۔ فرنگی محل نے ایسے مفسرین پیدا کئے تھے جن کا پلہ ملک بھر میں بھاری تھا البتہ علم وحدیث میں دلی کو لکھنؤ پر فوقیت حاصل تھی۔ علم رجال، علم حدیث کا تابع تھا۔ یہی علم حدیث کا ذوق ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالنے کا محرک ہوا تھا اور چونکہ اس کے نصاب تعلیم پر جدیدیت کا رنگ واضح تھا اس لئے یہ دارالعلوم بہت جلد جاذبیت کا مالک ہوگیا۔

اس دارالعلوم کا ابتدائی نقشہ ۱۸۹۲ء میں کانپور کے مدرسہ فیض عام میں تیار ہوا تھا۔ اس تحریک کے اصل محرک اور بانی سید محمد علی مونگیری تھے لیکن ان کے شرکائے کار ایسے چند علماء بھی تھے جن کا وقار عام مسلمانوں پر چھایا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان حضرات نے جب وفود روانہ کئے اور مسلمانوں سے اپیل کی تو اس درسگاہ کو قائم کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی اور اس ادارہ کو قائم ہونے کے بعد سے برابر مسلمانوں کی تائید حاصل ہوتی رہی لیکن بانیان دارالعلوم نے اپنی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لکھنؤ ہی کی سرزمین کو پسند کیا جس کی صرف یہ وجہ ہوسکتی تھی کہ اس شہر کی آب وہوا اور ماحول کو درس وتدریس کے لئے فرنگی محل نے بہت سازگار بنادیا تھا۔ ادارہ قائم ہوا اور جب اس کو علامہ شبلی مرحوم کی رہنمائی حاصل ہوئی تو فی الفور بام ترقی پر پہنچ گیا۔ مولانا کی ذات گرامی بہت ارفع واعلیٰ تھی۔ وہ صرف عالم علوم دین ہی نہیں تھے بلکہ ایک گراں مایہ ادیب، بلند پایہ شاعر، مفکر ومورخ بھی تھے۔ تحریر وتقریر دونوں میں کمال حاصل تھا۔ شعرالعجم اور موازنۂ انیس ودبیر کا مصنف ہوتے ہوئے ان کی عظمت مسلم ہوچکی تھی۔ انہیں کے نام پر مختلف صوبوں سے تشنگان علم وفضل اور پرستاران شعر وادب کھنچ کر ندوہ آ گئے تھے۔ یہاں تعلیم کا معیار بھی اچھا تھا اور سوسائٹی بھی بلند پایہ تھی۔ فرنگی محل میں اصول وفقہ اور مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے لیکن یہاں ایسے لوگ جمع ہوگئے تھے جو مغربی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک قبول ومنظور کرچکے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے دین پر استوار رہتے ہوئے مغرب سے بھی وہاں کی اچھی باتیں حاصل کرلی جائیں۔ لکھنؤ کے پرانے علماء کو اس جدیدیت کو اپنانے میں یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ اسلام کے مقدس اصول متاثر ہوکر اپنی ٹھوس حقیقت کھو بیٹھیں گے۔ ان کے نزدیک اسلام کے پیش کردہ دستور حیات میں کسی ترمیم وتغیر کی ضرورت نہ تھی۔ یہ صورت حال ندوۃ العلماء کے وجود نے نہیں پیدا کی لیکن زمانے کے تغیر نے ازخود مسلمانوں کو متغیر کردیا۔

ندوۃ العلماء ابتدائً خاتون منزل واقعہ محلہ کلن کی لاٹ، نزد مولوی گنج میں قائم ہوا تھا۔ روز افزوں ترقی کے تحت اپنی علیٰحدہ عمارت اور بہتر مقام کی ضرورت لاحق ہوئی۔ فراہمی سرمایہ میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کاکوری کے تعلقہ دار منشی احتشام علی مرحوم جن کی کوٹھی اس وقت بھی قیصر باغ کے مغربی چوراہے پر برقرار ہے، اس خدمت پر برقرار ہوئے۔ محلہ بادشاہ باغ میں گومتی کے کنارے جن رفیع عمارات اور وسیع و عریض آراضی پر اس وقت یہ دارالعلوم موجود ہے، ان کا حصول وتعمیر بڑی حد تک ان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ ادارہ علامہ شبلی ہی کے زمانے میں نئی عمارت میں منتقل ہوگیا تھا اور برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ اب اس کا شمار بین الاقوامی مکاتب میں ہے۔ اس کے موجودہ قائد اور رہنما مولانا علی میاں ندوی انتہائی قابلیت کے ساتھ منازل ترقی اور مدارج شہرت طے کرانے میں سرگرم ہیں اور اس ادارے نے دنیائے اسلام میں اچھی خاص مرجعیت حاصل کرلی ہے۔

راقم الحروف کو ندوۃ العلماء سے درس وتدریس کے سلسلہ میں کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن اس ادارہ کی وساطت سے میرا تعارف دو ایسی گراں بہا ہستیوں سے ہوا تھا جن کی یاد زندگی بھر تازہ رہے گی۔ ان میں سے ایک شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی، وہ اس ادارہ کے طالب علم کبھی نہیں رہے لیکن ایک زمانے میں 'الندوۃ' کی ایڈیٹری فرماتے تھے۔ اسی عمارت میں مقیم تھے اور مولانا شبلی سے افادہ حاصل کرتے تھے۔ میں اس زمانہ میں خاتون منزل کے قریب ہی عم محترم نواب غلام حسین خاں کی قربت میں اقامت پذیر تھا۔ مولانا مرحوم سے پہلی شناسائی اسی زمانہ میں ہوئی تھی اور یہ کہنا حرف بہ حرف صحیح ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے شعبوں اور بعض اہم معاملات میں انہیں کی ذات گرامی سے رشد وہدایت حاصل کی تھی۔ دوسری قابل قدر ذات حکیم عبدالوالی مرحوم کی تھی۔ موصوف کا تعلق جھوائی ٹولہ کے خاندان سے تھا اور ان کو علامہ شبلی سے بڑی قربت حاصل تھی۔ مولانا بھی ان کی ادبی صلاحیتوں کے قدردان تھے۔ والی مرحوم عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن شعروادب کے ذوق میں ہم دونوں ہم مذاق تھے۔ اس لئے میں ان سے بہت جلد تفاوت عمر کی کمزوری کو نظرانداز کرکے بے تکلف ہوگیا تھا۔ وہ زبردست نیشنلسٹ اور گاندھی جی کے پرستار تھے۔ انگریزی حکام سے ان کو بغض کی حد تک نفرت تھی اور ایک مرتبہ ملازمت میں ماتحت ہوتے ہوئے بھی بارہ بنکی کے انگریز کلکٹر کی تحقیر کرکے اس سے ملاقات کرنے سے انکار کردیا تھا جس کا خمیازہ ان کو بہت سخت بھگتنا پڑا تھا لیکن ان کے ابرو پر بل نہیں آیا اور نہ اپنے طور طریقے بدلے۔ وہ اتنی خوبیوں کے انسان تھے کہ ایسا مجمع الصفات پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ ❑❑❑

سرنگ

جواہر چودھری
16، گوشلیا پوری، چتاودروڈ، اندور
موبائل: 9826361533

سگپت سبزی کا جھولا لے کر گھر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ بیوی نے خبر دی کہ گلوبل کالج مین ایم سی اے کے پراسپکٹس مل رہے ہیں۔ بہن کا فون آیا تھا کہ ایک پراسپکٹس لے کر فوراً انہیں بھیج دیں۔ فارم پُر کرنے کے ایک مہینے بعد انٹرویو ہوں گے ورنہ وہ خود آ جاتیں۔ سونو کو لے کر اندور سے الٰہ آباد قریب تو ہے نہیں کہ بار بار آمد و رفت آسان ہو اور نہ ہی ناممکن ہے کہ گھر بار چھوڑ کر ایک مہینے کسی دوسرے کے گھر پر رہ لیا جائے۔

دوسرے دن صبح سگپت سٹی بس سے گلوبل کے لئے نکل گئے۔ یوں تو ان کے پاس اسکوٹر ہے لیکن اندور میں آج کل کے نئے کالجوں کی مسافت شہر کی آبادی سے کافی دوری پر ہوتے ہیں۔ ہائی وے پر ٹریفک کا یہ حال ہے کہ کب کوئی آپ کو مار کر نکل لے گا، کہا نہیں جا سکتا۔ آئے دن ایکسیڈنٹ کی خبروں سے اخبار بھرے رہتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اسکوٹر چلانے میں کافی سست رفتاری کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ آج کل بھیڑ اور بائیک پر اڑتے ہوئے نوجوانوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ سبکدوشی کے بعد ویسے بھی ٹھنڈا پن یا دوسرے لفظوں میں صبر آ جاتا ہے، اس پر بچوں کے بغیر اکیلے زندگی بسر کرنا مزید احتیاط برتنے پر مجبور کرتا ہے۔ ادھر اکثر سننے میں آتا رہتا ہے کہ بزرگ مرد و عورت کو قتل کر گھر لوٹ لے گئے۔ نہیں معلوم بڑے شہروں کی زندگی کیسی ہوتی جا رہی ہے۔ آدمی نہ گھر میں محفوظ ہے اور نہ ہی باہر۔ پیسا نہ ہو تو روتے روتے مرو اور ہو تو بے موت مرو۔ کئی بار انہیں احساس ہوتا ہے کہ اچھا ہی ہوا زندگی امن و چین سے گزاری ورنہ جوڑ کر رکھتے تو آج خطرے سے خالی نہ ہوتے۔ تنخواہ سے ہی ایک گھر تعمیر ہو گیا اور بچوں کی تعلیم بھی۔

پچاس منٹ کے سفر کے بعد کالج کے گیٹ پر اترے تو بھیڑ کر مایوس ہو گئے۔ اتنی لمبی لائن کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر یہ حال اس مہنگے کالج میں ہے تو ہو چکا سونو کا ایڈمیشن۔ سنا تھا کہ دہلی ممبئی کے کالجوں میں ہی مارا ماری رہتی ہے لیکن لگتا ہے کہ اندور بھی اب انہی کے پیچھے چل پڑا ہے۔ کوئی ترکیب نہ سوجھی تو وہ بھی لائن بھی لگ گئے۔

اور کیا انکل! آپ بھی ایڈمیشن لو گے کیا؟ ایک انجانی آواز آئی اور اسی کے ساتھ متعدد کھلکھلانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

سگپت کی آنکھوں کے سامنے اپنا زمانے کا منظر گھوم گیا جب وہ ہولکر کالج میں تھے۔ ان دنوں ہولکر کالج بھی شہر سے باہر تھا۔ اب تو بیچ شہر میں ہی مانا جاتا ہے۔ بھیڑ اتنی نہیں ہوتی تھی لیکن مزے لینے میں کوئی پیچھے نہیں رہتا تھا۔ اس مذاق سے انہیں غصہ تو نہیں آیا، ہاں وہ اپنی پرانی یادوں میں کھو گئے۔ کتنی شرارتیں ہوتی تھیں اور مار پیٹ بھی کتنی! لڑکیاں کم ہوتی تھیں لیکن جو ہوتی تھی وہ ایک طرح سے حکومت کرتی تھیں۔ دل میں خیال آیا کہ لڑکے کو شکریہ کہہ دیں پھر سوچا رہنے دو، ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تو دقت ہو جائے گی۔ کچھ دیر میں وہ اور لڑکے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ انہیں وہاں کھڑے کھڑے کب دو گھنٹے گزر گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔ پندرہ سو روپئے ادا کر کے انہوں نے پراسپکٹس لیا اور گیٹ کا رخ کیا۔

بہت سارے طلباء بس کے انتظار میں تھے۔ بس پہلے ہی سے بھری ہوئی آتی تھی اس لئے جگہ ملنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پھر سفر اور دو گھنٹے کی لائن سے انہیں تھکن کا احساس بھی تھا۔ سوچنے لگے کہ اچھا ہو، کسی سے لفٹ ہی مل جائے۔ اتنے میں ایک بس آئی بھی تو اسٹوڈنٹس اتنی تیزی سے اس میں بھر گئے کہ وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن تھی کہ شائد ان کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے یہ نوجوان طلباء باعزت انہیں بس میں داخل ہونے میں مدد کریں گے لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ انسان کا بوڑھا ہونا ایک بات اور بزرگ دکھنا دوسری بات۔ وہ سوچنے لگے کہ بال کالے کرنے کا

جواہر چودھری ہندی ادب کا بہت بڑا نام نہیں لیکن عصری ہندی فکشن میں انہیں معتبر افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے تہذیبی وراثت والے شہر اندور کے ایک مخصوص طبقہ کے کرداروں کو انہوں نے بڑی خوبی سے اپنی کہانیوں میں شامل کیا ہے۔ یہاں پر ان کی مشہور کہانی 'چھوٹے چھوٹے تاج محل' کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس کا اردو ترجمہ **عون محمد** نے کیا ہے۔

کوئی فائدہ تو ہے نہیں، الٹے نقصان ہی ہو جاتا ہے کہ اکثر۔ دوسری بس آنے میں ابھی وقت تھا لیکن پہلے والی بس آنے سے پہلے جتنی بھیڑ جمع تھی، اب اس کی دوگنی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر دل میں آیا کہ کوئی لفٹ دینے والا مل جائے، بھلے ہی اگلے اسٹاپ پر اتار دے تاکہ وہ بس میں تو سوار ہو جائیں۔ کئی بار خواہشیں معجزاتی طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک جان پہچان والا آدمی 'کانے' انہیں دیکھ کر ٹھہر گیا۔ پراپرٹی کا کام کرتا ہے، دلالی وغیرہ۔ بائیک کی سواری انہیں سمجھ میں نہیں آتی لیکن کانے کی خوشامد اور بس کی حالت نے انہیں خود کو اس کے لئے آمادہ کر لیا، سوچا، آگے کہیں اتر جائیں گے۔

کانے گفتگو کرتا ہوا جا رہا تھا کہ وہ ایک زمین دیکھنے مہو کی طرف گیا تھا۔ زمین جائداد کے دھندے میں آج کل محنت بہت ہے۔ آسانی سے کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔ اس دھندے میں پیسا تو لگتا نہیں اس لئے غنڈے، دادا اور نیتا اپنی طاقت سے کام چلاتے ہیں۔ ایک مرتبہ اگر یہ لوگ کہیں پہنچ گئے تو پارٹی ان کے چنگل سے باہر نہیں نکل پاتی۔ نیتاؤں سے پارٹنر شپ کے سبب پولیس کا معاملہ بھی سنبھل جاتا ہے، اس لئے کسی کا ڈر بھی نہیں۔ اس معاملے میں تو اندور ممبئی کا باپ ہے۔ ایک ایک پلاٹ میں کئی کئی بروکر ہوتے ہیں اور بروکر کے ساتھ درجنوں ایجنٹ۔ کسٹمر کے جال میں پھنستے ہی سب کے سب شکاریوں کی طرح جھپٹتے ہیں۔ المختصر کانے نے اپنے دھندے سے مطمئن نہیں تھا۔

سگپت بھی ایک پلاٹ کی خریداری کے خواہاں ہیں انوسٹمنٹ کے اعتبار سے۔ رٹائرمنٹ کا پیسا بینک میں جمع ہے لیکن بینک میں کیا ملتا ہے۔ ادھر ایک لاکھ کا پلاٹ دس سال میں پچیس لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ اندور میں کسی زمانے میں کوئی بھی زمینوں کا پرسان حال نہیں تھا۔ ان کے متعدد احباب ہیں جنہوں نے پلاٹوں میں رقم لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے آج کروڑ پتی بنے بیٹھے ہیں۔ یہی سب سوچ کر بولے، ہمیں بھی کوئی اچھا سا پلاٹ بتاؤ، کانے بھائی!

سگپت بھی ایک پلاٹ کی خریداری کے خواہاں ہیں انوسٹمنٹ کے اعتبار سے۔ رٹائرمنٹ کا پیسا بینک میں جمع ہے لیکن بینک میں کیا ملتا ہے۔ ادھر ایک لاکھ کا پلاٹ دس سال میں پچیس لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ اندور میں کسی زمانے میں کوئی بھی زمینوں کا پرسان حال نہیں تھا۔ ان کے متعدد احباب ہیں جنہوں نے پلاٹوں میں رقم لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے آج کروڑ پتی بنے بیٹھے ہیں۔ یہی سب سوچ کر بولے، ہمیں بھی کوئی اچھا سا پلاٹ بتاؤ، کانے بھائی!

وہ کوئی جواب دیتا اس سے قبل پانچ چھ بائیک سوار جوانوں نے ان کی گاڑی کو دونوں جانب سے گھیرنا شروع کیا۔ کانے کے لئے یہ بالکل غیر متوقع بات تھی، وہ گھبرا گیا۔ دونوں جانب سے دباتے ہوئے انہوں نے اسے کنارے آنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے تیور دیکھ کر سگپت سمجھ گئے تھے کہ نوجوان اب کانے کو

تبھی سگپت کے کانوں میں آواز آئی کے اس کے ساتھ بائیک پر کون تھا، اسے تلاش کرو۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسی کا ساتھی ہوگا۔ سگپت کو موقع مل گیا اور وہ کنارے ہوتے ہوئے دھیرے سے اسی بس میں چڑھ گئے جسے پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ بس میں بھیڑ تو کافی تھی لیکن سب باہر تاک رہے تھے۔ کسی طرح انہیں جگہ مل گئی اور وہ پیچھے کی سیٹ پر دبک گئے۔ گھبرائے اور پسینے سے تر سگپت پر لوگوں نے کوئی توجہ ہی نہ کی۔

ماریں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بڑے بڑے چاقو نکال لئے اور کانے پر ٹوٹ پڑے۔ کانے اپنی بائیک چھوڑ کر بھاگا اور سگپت گر پڑے۔ سارے لوگ کانے کی طرف دوڑے۔ افراتفری مچ گئی، سگپت کے ہوش اڑ گئے، ان کا چشمہ گر گیا، پراسپکٹس چھوٹ گیا، وہ جان بچا کر پوری طاقت سے بھاگے اور بھیڑ میں گھس گئے۔ کانے اس اچانک حملے سے زمین پر گر گیا تھا اور بے دم سا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس میں جان باقی رہنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب اتنی تیز رفتاری سے ہوا کہ کوئی کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔

تبھی سگپت کے کانوں میں آواز آئی کے اس کے ساتھ بائیک پر کون تھا، اسے تلاش کرو۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسی کا ساتھی ہوگا۔ سگپت کو موقع مل گیا اور وہ کنارے ہوتے ہوئے دھیرے سے اسی بس میں چڑھ گئے جسے پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ بس میں بھیڑ تو کافی تھی لیکن سب باہر تاک رہے تھے۔ کسی طرح انہیں جگہ مل گئی اور وہ پیچھے کی سیٹ پر دبک گئے۔ گھبرائے اور پسینے سے تر سگپت پر لوگوں نے کوئی توجہ ہی نہ کی۔ ماحول میں خوف کا سایہ تھا۔ ابھی بس چلی نہیں تھی۔ سامنے آئے حملہ آوروں نے ڈرائیور کو روکے رکھا تھا۔ ایک آدمی بس کے اندر جا کر کانے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اتر جاتا ہے۔ بس چل دیتی ہے۔ سگپت کی جان میں جان آئی۔ سوچا بچ گئے ورنہ جنہوں نے ایک انسان کی جان لے لی، وہ بھلا دوسرے کی جان لینے سے کیوں گریز کرے گا؟ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن گھبراہٹ اور پسینہ آلود پیشانی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

کافی آگے نکلنے کے بعد کچھ لوگوں کے منہ سے ضروری بول پھوٹتے ہیں لیکن زیادہ تر افراد ابھی اسے سکتے میں ہیں۔ ان کی حالت ابھی بھی غیر معمولی ہے۔ کنڈکٹر بغیر کچھ بولے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ کچھ کو ٹکٹ دیتا ہے اور کچھ کو نہیں۔ اب وہ بس جائے وقوع سے کافی دور راجیند رنگر آ چکی تھی لیکن مسافروں کی کھچا کھچی بندھی ہوئی تھی۔ بیچ کے اسٹاپ سے کچھ نئے مسافر سوار

ہوئے جنہیں چند لمحے پہلے کے حادثہ کی خبر بھی نہیں تھی۔ نئے مسافروں کی وجہ سے بس کا ماحول معمول پر آ گیا تھا لیکن کوئی بھی حادثہ کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔

نولکھا بس اسٹاپ سے پیدل گھر پہنچ کر سگپت نے گلوکوز پیا اور بیوی کو حادثہ کی خبر دی۔ یہ بھی بتایا کہ اب پراسپکٹس کے لئے دوبارہ جانا پڑے گا۔ شہر میں کیا ہوا، اب تک کسی کو پتہ نہیں چلا تھا۔ قرب و جوار والوں کو بھی یہ نہیں پتہ کہ سگپت کہاں گئے تھے۔ انہوں نے بیوی سے پوچھا، کسی کو بات چیت کے دوران بتایا تو نہیں کہ میں کہاں گیا تھا۔ بیوی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ مطمئن ہوئے۔ پھر بھی کسی انجانے خوف سے وہ دونوں گھر میں دبکے رہے اور شام تک باہر نہیں نکلے۔ غنڈوں کو تو بزرگ مرد و زن ایک آسان ہدف کی طرح لگتے ہیں، جب دل چاہا، اے ٹی ایم کی طرح استعمال کیا۔ رات کو بیٹے اور بہو سے فون پر بات ہوئی لیکن حادثہ کا ذکر نہیں کیا، کرتے بھی کیوں؟ ڈر تو روز ہی لگا رہتا ہے۔

دوسرے دن اخبار میں کانے کی قتل کی خبر سرخیوں میں تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ پولیس کو قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے لیکن احتمال ہے کہ کانے کے ساتھ جو بائیک سوار تھا، وہ بھی قاتلوں سے ملا ہو سکتا ہے، اس کی تلاش جاری ہے۔ سگپت کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ سوچا، کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ یہاں تو کسی سے مشورہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ خیال آیا کہ وہ خود جا کر پولیس کو اطلاع کر دیں لیکن ایسا کیا تو پولیس گواہ بنا لے گی اور سب جانتے ہیں کہ گواہ کی زندگی کتنی ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں لوگوں کو پولیس پر یقین کے مقابلے مجرموں کا خوف زیادہ ہوتا ہے۔ دوہرا خطرہ رہتا ہے کہ شناخت ہوتے ہی ایک بچا نہیں پائے گا اور دوسرا چھوڑے گا نہیں۔ وہاں کالج میں کوئی شناسا نہیں ملا نہ ہی کوئی راستہ میں۔ بڑے شہروں میں یہ اچھی بات ہے کہ کوئی کسی کو پہچانتا نہیں وہ چھوٹے شہر میں تو اب تک جنت کے مکینوں میں نام آ چکا ہوتا۔ ان کو بہتر یہی لگا کہ خاموشی اختیار کیا جائے۔ ان کا چہرہ دیکھ کر بیوی نے کہا کہ وہ پراسپکٹس اب کسی دوسرے سے منگوا لیں گی، اب آپ مت جایئے گا۔ پانی کا گلاس دیتی ہوئی بولیں،

شکر ہے خدا کا کہ کچھ ہوا نہیں ورنہ اتنے خطرناک حادثے میں الجھا ہوا آدمی ہارٹ اٹیک سے بچتا ہے کیا؟ ایسے میں ڈاکٹر کو دکھانا چاہئے، لیکن سگپت قطعی تیار نہ ہوئے۔ آج کل بات کہاں سے لیک ہو جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بلڈ پریشر کی جو دوا چل رہی

دوسرے دن اخبار میں کانے کی قتل کی خبر سرخیوں میں تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ پولیس کو قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے لیکن احتمال ہے کہ کانے کے ساتھ جو بائیک سوار تھا، وہ بھی قاتلوں سے ملا ہو سکتا ہے، اس کی تلاش جاری ہے۔ سگپت کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ سوچا، کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ یہاں تو کسی سے مشورہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔

تھی وہ ضرور ان کے معمول میں شامل رہی۔ کچھ کچھ وقفہ کے بعد انہیں محسوس ہوتا کہ پہلے سے کچھ آرام ہے۔ بابا رام دیو کو روزانہ ٹی وی پر دیکھتے ہیں لیکن بے چینی کم کرنے کے لئے کون سا یوگ کیا جائے، انہیں بالکل بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی ہلکی ہلکی سانس اندر باہر کر رہے تھے۔ رات کو یاد نہیں رہا ورنہ ایک کپ ہلدی دودھ پی کر سوتے تو کافی آرام ہو جاتا۔ بیوی کا مشورہ تھا کہ پورے یقین کے ساتھ ہنومان چالیسا پڑھنے سے فائدہ ہوگا، اس لئے وہ یہ بھی کر کے دیکھ رہے تھے اور ہر بار ہمت میں اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔

بیوی کا خیال تھا کہ شام تک تو سارے پکڑے جا چکے ہوں گے اور جیل میں بند ہوں گے، ویسے بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، انہوں نے لفٹ ہی تو لی تھی اور یہ کوئی جرم تو ہے نہیں اور مان لو کہ اگر کسی طرح پولیس کو پتہ بھی چل جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر بڑی اور گھبراہٹ میں قاتلوں کو نہیں دیکھا۔ یاد دلائیں گے کہ پولیس عوام کی مدد کے لئے ہوتی ہے پھر سگپت تعلیم یافتہ، مہذب اور سینئر سٹیزن ہیں۔ دل میں خیالوں اور شکوک وشبہات کا انبار رتھا اور دل ہی اس کا جواب دے کر انہیں تسلی دے رہا تھا۔ صبح سے شام تک وہ سوچتے سوچتے تھک گئے۔ اچانک وہ بیوی سے بولے،

دیکھو، اگر مجھے کچھ ہو جائے تو بینک ایف ڈی میں تمہارا نام بھی ہے۔ پنشن کی فائل بالائی خانے میں رکھی ہوئی ہے اور ڈھائی لاکھ روپئے زین کو بطور قرض دئے ہیں، اس کے کاغذات بھی وہیں موجود ہیں۔

زین کو کیوں دے دئے اتنے روپئے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔

دے دیئے، لیکن وقت رہتے بتا بھی تو رہا ہوں۔

سود بیاج کچھ طے کیا ہے نا؟

کیا ہے، سب لکھا ہے اس میں۔ میری جان جا رہی ہے اور تمہیں سود کی پڑی ہے۔

بیوی نے کلام منقطع کر دیا۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی، سگپت گھبرا کر باتھ روم کی طرف دوڑے، بیوی سے کہا، کوئی پوچھے تو کہہ دینا.....

کیا کہہ دینا، یہ انہیں خود نہیں سوجھ رہا تھا۔ بغیر کچھ بولے وہ باتھ روم میں گھس گئے۔ دروازے پر چار مکان کے فاصلے پر رہنے والے کانپورے اور ہڑ کے بھاؤ تھے۔

کیا بات ہے بھابی جی، آج سگپت نہیں آئے واک پر، سب لوگ منتظر تھے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا انکی؟

ہاں، ہاں، طبیعت ٹھیک ہے، بس یوں ہی ذرا

آنکھ لگ گئی، سوتے رہ گئے دوپہر کی نیند میں۔

اور ہاں، فون بھی بند ہے، کیا وہ بھی سوتا رہ گیا؟

فون کا کیا بھروسہ ہے بھائی صاحب! سرکاری ہے، کب ڈیڈ ہو جائے، کچھ بھروسہ نہیں۔ ابھی دیکھتی ہوں، آپ بیٹھئے، یہ آتے ہیں، باتھ روم گئے ہیں، سنتے ہو، کانپورے اور ہڑ کے بھاؤ آئے ہیں۔

سگپت منھ پر پانی کی چھینٹے مار کر تر و تازہ دکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ عموماً کانپورے ہی آتے ہیں، کچھ دیر بیٹھتے ہیں، چائے پیتے ہیں لیکن آج سگپت نے انہیں بیٹھنے کو نہیں کہا بلکہ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ کر کے جلد ہی فرصت پانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی جلد ہی دروازہ بند کر لیا، کھڑکیاں پہلے ہی سے بند تھیں۔ کانپورے اور ہڑ کے بھاؤ کو شک ہوتا ہے اور وہ لوگ کچھ دیر باہر کھڑے ہو کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دروازے پر پھر گھنٹی بجتی ہے۔ سگپت کو حاجت محسوس ہوتی ہے اور وہ باتھ روم کی جانب تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں، بیوی نے دروازہ کھولا، دیکھا، ہڑ کے بھاؤ اور کانپورے ہیں، وہ اندر آجاتے ہیں۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے بھابی جی، سگپ کچھ اکھڑے اکھڑے سے.....

نہیں، نہیں، کوئی دقت نہیں ہے۔ ذرا رات میں نیند نہ آئی، اس لئے.....

آپ نے تو ابھی بتایا تھا کہ دوپہر میں سوتے رہ گئے تھے؟

لیٹے تھے پر نیند نہیں آرہی نا۔

ڈاکٹر کو دکھایا؟

ہاں بات کی تھی، دوا کھائی ہے اب۔

ہم ٹھہریں کیا؟

ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی صاحب! اور ہوئی تو آپ لوگ کون سے بہت دور ہیں، آپ بے فکر رہیں۔

دونوں مطمئن تو نہیں ہوئے، پر کرتے بھی کیا، بالآخر چلے گئے۔

تم ایک کام کرو، دروازے پر باہر تالا لگا کر پیچھے سے اندر آجاؤ ورنہ پھر کوئی آئے گا، دیکھنا یہ دونوں بات پھیلا دیں گے اور کہتے سنتے کچھ منھ سے نکل گیا تو مصیبت ہوگی۔ سگپت بولے۔

شام ہو رہی ہے، دو تین گھنٹوں میں سناٹا ہو جائے گا اور پھر تالا لگانے سے جنہیں کوئی فکر نہیں ہے، انہیں بھی شک ہونے لگے گا۔ دن ڈھل گیا ہے، ٹی وی

فلم ایوارڈ شو آنے والا ہے، چلو وہی دیکھتے ہیں۔

ٹی وی کھولا تو اتفاق سے شاہرخ خان کا ڈانس آرہا تھا۔ سگپت شاہرخ خان کے مداح ہیں۔ اسکرین پر دیکھتے ہوئے دیوانگی چھانے لگتی ہے، شاید ہی کوئی فلم انہوں نے چھوڑی ہو، زیادہ تر فلمیں پانچ چھ مرتبہ سے زیادہ دیکھی ہیں۔ وہ اکثر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شاہرخ نے سلمان جیسا جسم بنانے میں چہرے کی ملائمیت ختم کر لی ہے۔ اس کے چہرے سے شرارتی پن تو جیسے کھو گیا ہے۔ کئی بار میاں بیوی میں شاہرخ کو لے کر بحث مباحثہ بھی ہو جاتا ہے۔

'یہ تو پکا ہے کہ شاہرخ میں اب وہ بات تو نہیں رہی۔' بیوی نے سگپت کی توجہ حادثے سے ہٹانے کے لئے یہ بات چھیڑی۔

'فالتو بات تو کرو مت تم' یہ کہتے ہوئے سگپت نے ٹی وی کی آواز بڑھا دی۔ اس وقت شاہرخ 'چل چھیا چھیا' پر ڈانس کر رہے ہیں۔ نزدیک ہی بہت سی تتلیاں رنگ بکھیر رہی ہیں۔ ان کے ملبوسات کے سلسلہ میں شبہہ ہوتا ہے کہ ہیں بھی یا نہیں۔ جب ناظرین کو محسوس ہوتا ہے کہ 'نہیں ہیں' تو وہ اچانک 'ہیں' ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحہ پھر وہی پرانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سگپت کو یاد آتا ہے کہ وہ بھی کبھی فلموں میں اداکاری کرنے کی سوچا کرتے تھے۔ اگر چلے گئے ہوتے تو آج بوڑھی ہو کر 'ماں' کا کردار نبھا رہی اداکاراؤں کے ہمراہ ضرور ڈانس کر چکے ہوتے۔

کال بیل بجنے سے ان کی توجہ دروازے کی طرف ہو جاتی ہے۔ بیوی اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ اچانک دو نوجوان انہیں ڈھکیلتے ہوئے اندر آجاتے ہیں اور شور نہ مچانے کی ہدایت دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں سگپت کا پرس ہے اور وہ اس میں رکھے ہوئے فوٹو سے پہچانتے ہیں، ایک بولا،

یہ پرس آپ کا ہے نا انکل؟ آپ ہی تھے کانے کی بائیک پر؟

سگپت کا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ آواز جیسے غائب ہو جاتی ہے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی گہری سرنگ میں کھینچ لئے گئے ہیں اور تیز رفتاری کے ساتھ کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کی راہ پر گامزن ہیں۔

❑❑❑

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

حامد عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی پانچویں کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی تیسری قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

کچھ دن بعد اسحاق نے اپنا نیا مکان بنانے کی شروعات کی جس مکان میں وہ لوگ رہ رہے تھے وہ کچھ برا نہ تھا لیکن اس میں اس کا چچیرا بھائی بھی رہ رہا تھا۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ اس مکان کے ایک دالان میں رہتا تھا۔ اسحاق کا نیا مکان بنتے ہی پرانا مکان خود بخود اس کے استعمال میں آجاتا، اس لئے اس نے اسحق کو نئے مکان کی ضرورت کا قائل کرلیا تھا۔

اسحق کے بارے میں اس کے چچیرے بھائی نے کچھ اندازے لگا رکھے تھے۔ اسحق کبھی روپئے پیسے سے اس کی مدد نہیں کرتا تھا اور جیتے جی اس دالان سے کسی بڑی جگہ منتقل ہونے کا اسے کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لئے اس نے اسحق کو نیا مکان بنانے پر راضی کرنے کی ترکیب نکالی تھی۔

اسحق نے ایک دن مکان کی جگہ طے کی، پھر نیو بھرنے کی رسم ادا کی۔ اس نے کھجوریں اور ناریل بانٹے اور کھدائی کا کام شروع کیا۔ مزدور کام پر لگ گئے۔ جامیہا پتھر (کونکن کے علاقہ میں پایا جانے والا سرخ پتھر جسے تعمیر میں استعمال کیا جاتا ہے) وہاں آکر ڈھیر ہونے لگے۔ راج مزدور نمودار ہو گئے۔ بڑھئی لکڑی کاٹتے دکھائی دینے لگے۔ اس جگہ خوب چہل پہل محسوس ہونے لگی۔ سردی اب پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں ارہر اور پاوٹے کے پودے سوکھ گئے تھے۔ واششٹھی ندی کے بہتے پانی پر تیز ہوا کے جھکڑوں سے لہریں اٹھنے لگیں۔ دن لمبا، اکتایا ہوا اور سست رفتار محسوس ہونے لگا۔ دوپہر گرم توے کی طرح تپنے لگی۔ شام کے وقت سورج بے جان سرخ رکابی کی طرح واششٹھی ندی کے پانی پر ڈولنے لگا۔

مجھے ان لمبے دنوں سے وحشت ہونے لگی۔ بمبئی واپس جانے کا خیال میرے دل میں گھومنے لگا لیکن مجھے اپنے پوری طرح صحت یاب ہونے کا یقین نہیں تھا اور بابا کی بھی خواہش تھی کہ میں ابھی کچھ دن اور ٹھہروں۔ اس کے علاوہ مجھے ڈر تھا کہ بمبئی میں کاموں میں پھنس کر طبیعت پھر خراب نہ ہو جائے۔ میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور شام کی تکان دور کرنے کی غرض سے گھر سے نکل کر ٹہلنے لگا۔ اب میں بازار کی سمت بہت دور تک پیدل چلنے لگا۔

اسی سڑک پر اسحق کا مکان بن رہا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار کام چلتے ہوئے دیکھا لیکن پاس نہیں گیا۔ اسحق کو اچھا نہیں لگا کہ میں نے اس کے نئے مکان کو نظر انداز کر دیا۔ مجھ سے اپنا جان بوجھ کر شروع کیا ہوا جھگڑا بھول کر وہ ایک دن سڑک پر میرے سامنے آگیا اور اپنے زیر تعمیر مکان کو دیکھنے کی درخواست کی۔ میں مجبوراً اس کے ساتھ چلا گیا۔

اس کے مکان کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ نیو بھری جا چکی تھی۔ مزدور وہاں مسلسل کام کر رہے تھے۔ اسحق نے جلدی سے مکان نقشہ مجھے لا کر دکھایا اور تفصیل سے بتانے لگا کہ مکان کے کمرے کتنے ہیں، دروازے اور کھڑکیاں کہاں کہاں ہیں اور چبوترا کتنا لمبا چوڑا ہوگا۔ لیکن میرا دھیان اس کے مکان کے نقشے سے ہٹ کر اس کے مزدوروں میں شامل لکشمی کی طرف ہو گیا تھا۔

لکھیا مہار کی بیٹی لکشمی بہت اچھی شکل صورت کی تھی۔ اس کی رنگت حیران کن حد تک صاف تھی اور سیاہ فام مہار عورتوں میں الگ دکھائی دیتی تھی۔ وہ چٹکی بجاتے کسی کا بھی دھیان اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور باپ کے پاس آکر رہنے لگی تھی لیکن شوہر کچھ کچھ دن بعد اس کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا، وہ اس سے واپس لوٹنے کی التجا کرتا تھا، کبھی زبردستی اٹھا لے جانے کی دھمکیاں بھی دیتا تھا لیکن لکشمی پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے شوہر کی طرف بالکل پیٹھ پھیر لی تھی۔ وہ میرے سامنے خاموشی سے جامبھا پتھر اٹھا اٹھا کر لے جا رہی تھی اور بیچ بیچ میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی اسحٰق کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اسحٰق نے مجھ سے کہا، 'اس لکشمی کو دیکھا؟ اسے کام پر رکھ لیا ہے۔'

میں کچھ نہ بولا، لیکن اسحٰق کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے مزید بتانے لگا، 'بڑی اکڑباز لڑکی ہے، کسی کی پروا نہیں کرتی لیکن مجھے اکڑ نہیں دکھاتی، کیا سمجھے؟'

اس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے آپ ہی آپ مسکرا کر اس کا ہاتھ ہٹایا اور کہا، 'ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔'

'اچھا، لیکن کبھی پھر آنا۔'

'ضرور، ضرور۔'

'اور اس دن میں نے جو کہا تھا، اس پر ناراض مت ہونا۔'

'ارے نہیں! وہ تو میں کب کا بھول بھی گیا۔'

'واہ واہ! تم بھی خوب ہو۔'

وہ کہتے ہوئے مڑا اور لکشمی کی چال پر نظر جما لی۔ میں وہاں سے چل پڑا، سڑک پر آیا اور دھیرے دھیرے گھر واپس آ گیا۔

مہاروا ڑا، دستور کے مطابق قصبے سے بالکل لگا ہوا لیکن کنارے پر واقع تھا۔ لکشمی کے روپ کی طرح اس کے محلے میں بھی کافی تبدیلیاں دکھائی دیں لیکن بعض تبدیلیاں بڑی عجیب طرح کی تھیں۔ وقت کی رفتار کو پیچھے چھوڑتی ہوئیں، مضحکہ خیز تبدیلیاں۔ مہاروں کے لڑکے اب بال کٹوانے لگے تھے، انگریزی اسکولوں میں پڑھنے لگے تھے۔ ان سب نے بودھ دھرم اختیار کر لیا تھا۔ مسلمانوں کے تابوت کے جلوس میں اب وہ آگے آگے ناچتے ہوئے نہیں چلتے تھے۔ اب انہوں نے مسلمانوں کے چھوٹے موٹے کام کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے برتاؤ سے برسوں سے پچھڑے ہوئے ہونے کے خود بخود بڑھتے ہوئے شعور کا اظہار ہوتا تھا۔

جدید دور کے مشہور شاعر اور معروف فلمی نغمہ نگار ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی نے 'نیا دور' کے بیحد اصرار پر ندا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھنے کی حامی بھر لی ہے۔ جلد ہی 'نیا دور' کے آئندہ کسی شمارے میں محترمہ مالتی جوشی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

مسلمانوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ انہیں یہ خیال بے چین کرنے لگا کہ یہ شعور اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو ان کے کھیتوں میں کام کون کرے گا۔ انہیں خوف تھا کہ کل مجبوراً انہیں اپنی عورتوں کو باہر نکال کر کھیتوں میں کام پر لگانا پڑے گا لیکن لکشمی کی طرح کچھ مہار اب بھی ان کے لئے کام کرتے تھے۔ اب تک ہٹ دھرمی بودھوں میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان اپنے آپ سے کہتے، 'آج تو بیت گئی، کل کا کل دیکھیں گے۔'

اسحٰق کے مکان کی تعمیر کا کام اب زوروں پر تھا۔ اس کے سامنے جامبھا پتھروں کے ڈھیر کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ ان پر راج مزدوروں کے چھلنی ہتھوڑے چلنے لگے۔ بڑھئی ساگوان کی لکڑی چیرنے اور چھیلنے لگے، لوہے کے لمبے لمبے سریے کھڑے ہونے لگے۔ سیمنٹ اور ریت کا آمیزہ تیار ہونے لگا اور اسحٰق دھوپ میں کھڑا خود اس کام کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ تپتی دھوم میں کام کرتی پسینے میں نہائی ہوئی لکشمی پر نظر جمائے رہتا۔

ایک دن دوپہر کی تپتی دھوپ میں لکشمی کا شوہر اس کو لینے آیا۔ اس سے پہلے وہ اس کے باپ کے پاس گیا تھا۔ لکشمی کے باپ نے اپنے بس بھر اس سے عزت کا برتاؤ کیا، بیٹھنے کو کہا، چائے پانی کو پوچھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، 'لکشمی کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔' 'کام پر گئی ہے۔' باپ نے بتایا، 'شام کو لوٹے گی۔ تب تک ٹھہرو، کھانا کھا لو، میں اس کو جانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تب تک کوئی مشکل کھڑی مت کرنا۔'

لیکن لکشمی کا شوہر نہ مانا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ 'میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے ابھی فیصلہ چاہئے، اسے میرے ساتھ چلنا چاہئے یا نہیں، اگر وہ نہ مانی تو اسے زبردستی لے جانے کی طاقت مجھ میں ہے۔'

لکشمی کا باپ جان گیا کہ داماد کا رنگ اس وقت کچھ اور ہی ہے۔ اس نے سوچا، پہلے ہی غصے میں ہے، اسے اور تپانا ٹھیک نہیں۔ اس لئے وہ اٹھا، داماد کو ساتھ لیا اور اسحٰق کے زیر تعمیر مکان پر آ پہنچا۔ دوپہر کے جلتے سورج میں پسینے پسینے ہوتی لکشمی نے دور سے باپ اور شوہر کو آتے دیکھ لیا۔ سر پر رکھی ہوئی سیمنٹ کی بوری نیچے رکھ دی، ساڑے کے پلو سے چہرہ پونچھا اور مکان کے ایک اوسارے میں جا کھڑی ہوئی۔ باپ اور شوہر اس کے سامنے آ گئے اور اس سے بات کرنے لگے۔ وہ مجبوراً ان کی بات سنتی رہی۔ (بشکریہ 'آج')

جاری

بسمل

پروفیسر عبدالخالق رشید
سربراہ پشتو زبان وادب، جے این یو، نئی دہلی
موبائل: 9871878120

کہتے ہیں کہ ''ہوا نہ چلے تو کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا ہے۔'' ان لوگوں میں بھی اچھائی اور برائی بہت تھی۔ وہ لوگ وحشیوں کی طرح کابل پر چڑھ آئے۔ جو کچھ بھی انھیں ہاتھ لگا مالِ غنیمت شمار کرتے ہوئے اپنے کندھوں پر اٹھالے گئے۔ وہ لوگ شہر میں انسان کی طرح نہ آئے بلکہ ایک وبا کی طرح داخل ہوئے۔ ہاں کابل شہر پر حملہ آور ہوگئے، خوبصورت کابل پر۔ اسی کابل پر، جس پر کہ پشتون دوشیزائیں اپنے گیتوں میں بھی بددعاؤں کی روادار نہ ہوتیں۔ ہاں بددعاؤں کی: ''کابل کومت کہو برباد ہو۔ ہیں خوابیدہ یہاں بانکے خوبصورت جوان''

لیکن ان حملہ آوروں نے کابل میں نہ تو خوبصورت جوانوں کو بخشا اور نہ ہی پرشکوہ عمارات و مقامات کی رعایت کی۔ سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ ان وباؤں نے سب کچھ نگل لیا۔ تاریک شب وروز لوگوں کا مقدر بنادیا۔ عزت وشرف کے حامل بے شمار لوگوں کو ذلیل و رسوا کیا، اور بہت سے رذیلوں کو معزز مقامات پر فائز کر دیا، لیکن وہ تب بھی عزت وشرف کے حق دار نہ ہو پائے۔ ہم لوگ ان تمام المیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کس طرح کابل کے نوجوان ہلاک کیے جارہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ یہ شہر کیا سے کیا ہوگیا۔ ہم نے دیکھا کہ شہر کس طرح خاکستر ہوگیا، کس طرح لوٹ پاٹ کا شکار ہوا، اور کس طرح لڑائی اور کشت وخون کی وباؤں نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ جہاں شہریوں کو سکون سے مرنے کی فرصت بھی میسر نہ تھی۔

ہاں، ہم لوگوں نے یہاں سب کچھ دیکھا، سب کچھ!

انہی ایام میں ہمارے ایک رشتہ دار نے ایک دلچسپ خبر کی اطلاع دی۔ اس وقت جب سب لوگ ناشتے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ یک لخت اس کی زبان سے نکلا:

''کیا آپ کو معلوم نہیں؟''

''کس چیز کے بارے میں؟''

> افغانستان کی مقامی زبان پشتو کے ادبی شہ پارے ہندوستان میں کم دستیاب ہوتے ہیں۔ اردو میں اس زبان کے تراجم یہاں بہت زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ 'نیا دور' میں پہلی مرتبہ پشتو زبان کی کہانی 'بسمل' پیش کی جارہی ہے جس کے مصنف جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پشتو زبان وادب کے سربراہ پروفیسر عبدالخالق رشید ہیں۔ اس کہانی کا اردو ترجمہ **ڈاکٹر محمد حیات الدین** نے کیا ہے۔

''کمانڈر بہادر خاں بھی کابل پہنچے ہوئے ہیں۔''

''وہ زنگی گریڑیے کا بیٹا؟''

''ہاں، لیکن دھیان رہے کہ اب یہ الفاظ آپ کی زبان سے نہ نکلیں۔ وہ اب سینکڑوں مسلح افراد، گاڑیوں اور .... کا مالک ہے۔ وہ اب کوئی کم ذات 'بہادری' نہ رہا۔ اس کے نام کے ساتھ اب 'بہادر خاں' کا لقب جڑ گیا ہے۔ ہاں بہادر خاں! وہ کمانڈر صاحب کا بہت قریبی آدمی ہے۔''

گفتگو کچھ اس طرح اپنے اختتام کو پہنچی۔

میں نے بہادری کو بہت پہلے دیکھا تھا۔ جب میں سردی کے زمانے میں اپنے گاؤں جایا کرتا تھا تو وہاں کبھی کبھار اسکول کے بچوں کو عصری علوم کی کتابیں پڑھایا کرتا تھا۔ انہی بچوں میں یہ ''بہادری'' بھی تھا، جسے گاؤں والے باولا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ میرے پاس پڑھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں وہ نہایت کمزور تھا اس لیے اسے پڑھانے میں بہت پریشانی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس میں تعلیم کی تو کوئی سمجھ ہی نہ تھی۔ تاہم اس کے والد اسے بہت مشکل سے زور زبردستی میرے پاس لایا کرتے تھے۔ میں بھی اسے پڑھانے کے لیے اپنا خونِ دل کیا کرتا اور پڑھاتا رہتا تھا۔

ایک دن میں دوپہر کے وقت ایک جنازے سے فارغ ہوکر تھکا ماندہ گھر پہنچا ہی تھا کہ ہماری گلی میں ایک راکٹ کا گولہ آکر گرا۔ جس کی وجہ سے کئی لوگ زخمی اور کئی ہلاک ہوگئے۔ اس دن بھی اسی طرح کے المناک واقعات رونما ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے میں بہت رنجیدہ تھا۔ ہمارے پڑوسی کی جوانی ''ربانی'' کی بادشاہی سے اعلیٰ وارفع نظر آرہی تھی۔ میں ابھی اسی سوچ وفکر میں محو تھا کہ ہمارے گھر کے سامنے بہت سی گاڑیاں دفعتاً آکر رکیں۔ میری بیٹی تو گاڑیوں کی قطار کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی:

''گاڑیاں .... ہتھیار بند لوگ.... اندر آیئے اباجان!''

میں نے جب کھڑکی سے اس کی طرف نظر

دوڑائی، تو دیکھا کہ وہاں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ طرح طرح کی ہیئت وشباہت والے افراد وہاں موجود تھے۔ان میں سے کچھ تو نیچے اتر آئے اور کچھ اب بھی انہیں گاڑیوں میں بیٹھے رہے۔ سب کے سب مسلح تھے۔میں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ شاید یہ لوگ کسی کے رشتہ دار ہوں گے۔میں ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ لوگ ہمارے گھر کے سامنے آدھمکے، اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔

''....گھر میں کوئی ہے؟''

''نہیں''

''ان سے کہو کہ بہادری ہم وطن ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں دروازہ کھول کران کے پاس گیا۔ جہاں ایک دراز قامت نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔میں نے سب کی خیرت دریافت کی، اور سبھی کوگھر کے اندرآنے کی دعوت دی۔ سب لوگ مہمان خانے میں آکر بیٹھ گئے۔تقریباً چودہ پندرہ سال قبل میں اپنے گاؤں گیا تھاجہاں اس وقت میں نے ان نوجوانوں میں سے کسی کونہیں دیکھا تھا۔سبھی نے فرداً فرداً اپنا تعارف پیش کیا۔تاہم میں انہیں محض ان کے والدین کی نسبت سے ہی پہچان پایا۔

اس موقع پر گزرے ایام کی یادوں اور باتوں کو ہم نے پھر سے تازہ کیا۔چودہ سال کی طویل مدت میں بہادرخاں نے جوبھی بہادری کی تھی ان تمام واقعات کووہ ایک ایک کرکے بتانے لگا۔اس نے وہ تمام باتیں بتائیں کہ اس نے کتنے اساتذہ، کتنے پولیس کے جوان، کتنے ملازمین ، کتنے علما، کتنے شہریوں، اور کتنے عزت وشرف کے حامل افرادکوکس کس طرح سے ہلاک کیا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے پے درپے غزنی شہر پربھی حملہ کیا تھا، جہاں بہت سے گھر اورزیارت گاہیں ان حملوں کے نتیجے میں تباہ وبرباد ہوگئی تھیں۔اور آخر میں اس نے یہ بھی بتایا کہ:''اب میں مزید اس طرح کے ناروا کام نہیں کرتا ....کیونکہ ابھی ابھی اقتدار ہمارے ہاتھ میں آیا ہے....!''

'بہادری' حسب معمول ہمیشہ ہمارے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔اس نے بارہا چپکے سے کہا کہ''کمانڈر صاحب سے آپ کا تعارف کرادوں گا۔''لیکن میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا رہتا۔ابھی بہت زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ کابل میں پھر سے لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ تاہم اس جگہ جہاں بہادری اوراس کی جماعت قیام کررہی تھی وہاں بہت خوں ریزلڑائیاں ہوئیں۔لیکن بہادری بھی اپنے مورچے پر مضبوطی سے ڈٹا ہوا تھا۔ایسے نامساعد حالات میں، میرے وہ رشتے دار جن کا بہادری کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، اس کے پاس خیریت دریافت کرنے کے لیے بڑی مشکل سے پہنچ پاتے تھے۔اس لیے کہ ہمارے علاقے کا بہادرخاں اب کابل میں بہادری کررہا تھا، اورکابل شہر کے رہنے والوں کو ہلاک کررہا تھااورانہیں بھاگ جانے پر مجبورکررہا تھا۔

بہادرخاں نے تو لوٹ مارسے اتنا مال جمع کرلیا تھا کہ اس کے پاس رکھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ اتنے انسانوں کواس نے موت کی ڈگر پر ڈال دیا کہ وہ مزید اس طرح کی ہلاکت کی یکسانیت سے اُکتا چکا تھا، مثلاً لوگوں کو گولی مارنے اور ذبح کرنے سے۔اسی لیے تو اب وہ انسانوں کی ہلاکت میں بھی زمانے کی روش سے کام لیا کرتا تھا۔

مطلب یہ کہ لوگوں کو وہ طرح طرح سے ہلاک کیا کرتا تھا۔ بڑے کمانڈر صاحب بھی جب لوگوں سے انسانوں کی ہلاکت کی ایجادِنو کے بارے میں سنتے تو انہیں ایسا لگتا جیسے وہ خود میں اس طرح کے واقعات پرفخر کا احساس کرتے ہوں۔ایسا لگتا تھا کہ وہ اس طرح کے شرمناک افعال انجام دینے والوں کی داماد کی طرح ناز برداری کرتے تھے۔

جب میں نے بہادر خاں کو پھر سے انہی لڑائیوں میں سرگرم عمل دیکھا، تو میں نے اس سے کہا:

''تم نے تو توبہ کرلی تھی کہ یہ ناروا کام پھر دوبارہ نہ کروں گا۔''

تاہم وہ میری اس بات سے صرف نظر کرگیا، اوراس کی زبان سے صرف اتنا نکلا:

''....محترم! آپ تو سمجھ دار آدمی ہیں۔ہماری باتوں سے دھوکہ مت کھایئے۔ ہماری باتیں توبہ سے بلندوبعید ہوتی ہیں۔ ان لڑکوں''ہتھیار بندلوگوں'' کو مستحکم ومنظم رکھنا کوئی آسان کام تونہیں ۔یہ سب جوا کھیلتے ہیں، چرس پیتے ہیں اورلڑ کے....اگرانہیں کہا جائے کہ لڑائی مت کرو۔تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔آپ کو چاہیے کہ تمام صورت حال کو ہماری نظر سے دیکھیں نہ کہ اپنی نظر سے۔ہم لوگ اگر ایک جگہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کرقسم کھاتے ہیں تو فوراًہی اپنی جگہ تبدیل کردیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم نے تو وہاں قرآن مجید پرحلف لیا تھا، لیکن یہاں نہیں!''

بہرحال اس نے میری دلجوئی کی اور مجھے سمجھاتے ہوئے کہا:

'جناب ٹھنڈے لوہے سے کوئی چیز نہیں بن سکتی۔'

جس وقت اس نے ہمیں خداحافظ کہا، تو وہ اسی لمحہ میرے رشتے دار کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کچھ یوں کہا:

''کبھی میرے بنگلے پر بھی تشریف لایئے کہ آپ کو'رقصِ بسمل' دکھاؤں۔''

بہادرخاں نے اپنی اس بات سے ہم سب کو استعجاب میں مبتلا کردیا کہ آخر جاتے جاتے یہ کیا کہہ رہا ہے۔میرے رشتے دار نے پھر سے دریافت کیا!

''رقص بسمل کیا ہے؟''

''خیر، آپ تشریف لائیں ، یہ بہت دلچسپ تماشا ہے: یہاں تک کہ کمانڈر صاحب بھی اس تماشے کو دیکھنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔''

اس گفتگو کے بعد تقریباً بیس راتیں گزر گئیں کہ دوبارہ بہادری''بہادرخاں'' سے کوئی بات چیت نہ

ہوئی۔ میرے رشتے دار نے بار بار مجھ سے دریافت کیا کہ یہ ''بسمل رقص'' کیا چیز ہے کہ بہادری نے اس کی اتنی تعریف کی۔ میں بھی اس سے واقف نہ تھا۔ اور نہ ہی اس طرح کی کسی نئی ''اصطلاح'' کو سمجھتا تھا۔ سب لوگ یہ قیاس کر رہے تھے کہ شاید یہ بہت زیادہ نشے کی حالت میں کسی رقص کو کہا جاتا ہوگا، اور یا پھر شاید کوئی باہری رقاصہ ہوگی۔ اب یہاں محفل سجے گی۔ اسی طرح کی اور بھی قیاس آرائیاں ہم لوگ کر رہے تھے۔

ہمارے ذہن میں اکثر بہادر خاں کی یہ پُراسرار باتیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ ایک رات بہادر خاں کے ہیڈ کوارٹر کے علاقے میں بہت سخت لڑائی ہوئی۔ دوسرے دن صبح میں ہمارے وہی رشتے دار، ہاں صبح میں کہ جب کابل کی فضارات کی طویل لڑائیوں کے گرد و غبار سے اداس اداس تھی، بہادر خاں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے پہنچے۔ جہاں سب سے بہادر خاں کی خیریت دریافت کی۔ انہی دنوں میں بہادر خاں کے ایک پیر پر راکٹ کا کوئی ٹکڑا بھی لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی غضبناک ہو گیا تھا۔

اس کے خوبصورت بنگلے کے باغ میں ''راکٹوں'' اور توپ کے گولوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ اس روز وہ اسی بنگلے میں موسمِ بہار کی دھوپ میں بیٹھا ہوا تھا، اور سامنے کی طرف اپنے زخمی پیر کو پھیلائے ہوئے تھا۔ ایک نوعمر لڑکا بار بار اس کے لیے چلم جلا رہا تھا۔ اپنے ہم وطن کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ پہلے تو اس نے نوعمر لڑکے کو آواز دی:

''اے لڑکے! چلم جلاؤ۔ ان پاگل چرسیوں میں سے فلاں کو میرے پاس لے آؤ۔ چائے بھی گرم کرو۔ ہاں، سرداری چائے!''

''اچھا صاحب حکم بجالاتا ہوں۔''

بہادر خاں پھر ایک دوسرے گھنے بالوں والے آدمی کو طلب کیا:

''اے گھنے بالوں والے لڑکے! ان قیدیوں میں سے ایک تندرست اور موٹے آدمی کو 'بسمل' کے لیے لے آؤ۔ ہاں، یہ دھیان رہے کہ وہ موٹا اور پر گوشت ہوتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کود سکے۔'

''ہم نے جن لوگوں کو پرسوں گرفتار کیا تھا، ان میں سے ایک ''بسمل'' کے لیے بہت مناسب ہے۔ وہ خوب لمبا تڑنگا ہے، اور خوب تندرست! اور باقی تو تم جانتے ہی ہو کہ تمہارا اور کیا کام ہے۔''

ان دنوں کابل کے موسمِ بہار کے شب و روز تھے۔ دوپہر کے بعد ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہوتی تھی۔ اس سے قبل تو یہ ایام کابل کی خوشیوں اور خوشحالیوں کے شب و روز ہوا کرتے تھے۔ سیر و تماشے کی راتیں ہوا کرتی تھیں اور قہقہوں کے لامتناہی سلسلے ہوا کرتے تھے۔ پغمان کی خوبصورتی کا، چہلستون کے چکروں کا، اور بربن کی نزاکتوں اور لطافتوں کا جشن ہمیشہ ان ایام میں سرگرم و رواں دواں رہتا تھا۔ اور انہی راتوں میں کابل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گل و گلزار ہوتا تھا۔ لیکن افسوس کہ اب یہاں موت کے تھپیڑے ہیں۔

موت کے سوداگر کابل کی معصوم روحوں کو اپنی حصار میں مقید کیے ہوئے تھے، اور کابل کی اس گھٹن بھری فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بس آتی اور جاتی رہتی تھیں۔ کابل کا نیلگوں آسمان اب تقریباً مٹیالہ اور غبار آلود ہو گیا تھا۔ اب موسم بہار کی برسات کے دنوں میں سارس پرندے کی قطاروں نے بھی اپنے راستے بدل لیے تھے۔ اب تو وہ پرندے اس طرف جھانکتے بھی نہ تھے۔ ان پرندوں کی بجائے، اب یہاں وہاں ایک آدھ کوّے ہی فضا میں نمودار ہوتے تھے، جن کی نہ تو کسی کو پرواہ ہوتی تھی اور نہ ہی وہ کسی کو بھاتے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کھانے اور چائے کا دور چلا۔ نماز کا تو کسی نے نام بھی نہ لیا، اور نہ ہی کسی کو اس کا دھیان تھا۔ سب لوگ اسی جگہ جمع تھے جہاں کہ وہ آج کے تندرست اور موٹے تازے محصور شخص کا 'بسمل رقص' دیکھتے۔ اگرچہ ان لوگوں کے لیے یہ تماشا کوئی نیا نہ تھا، لیکن یہ تماشا اب ان لوگوں کے لیے تفریح کا باعث ہو گیا تھا اور غم غلط کرنے کا ایک موقع۔ اسی لیے سب اسی تماشے کے انتظار میں تھے۔ چند ہی لمحے کے بعد ایک ہاتھ بندھے قیدی کو لایا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی فضا میں آشوب زدہ آنکھوں کی طرح جھپک رہی تھیں اور جن میں سورج کی طرف دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔ اسے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ گھنے بالوں والا شخص، جیسے کہ وہ دوزخ کی ایک دریافت ہو، اس کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا، اور بہادری کے تحکم آمیز اشارے کا منتظر ہو گیا۔ پھر بہادری کے سر ہلا کر اشارہ کرتے ہی اس نے اپنا کام شروع کر دیا:

ایک طرف اس گھنے بالوں والے شخص کے بائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا تیز چاقو تھا اور دائیں ہاتھ میں ایک چھری تھی، وہیں دوسری طرف دھوپ کی تمازت بھرے دن میں اس قیدی 'شخص' پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ دو تین بار چاقو کی نوک سے اس کے بدن میں اس طرح گڑایا جیسے کہ اس کے بدن میں گویا خون ہی نہ ہو۔ مگر اس کے ''گناہگار!'' کا ہیجان اس کے بعد بتدریج بڑھتا گیا۔ اس لیے کہ اسے اس قیدی کو حقیقی عملی ''بسمل'' کے لیے اچھی طرح تیار کرنا تھا۔ اس لیے وہ بار بار چھری کی نوک سے اس قیدی کو زدوکوب کرتا رہا، اور ہر بار وہ قیدی، جیسے کہ اسے بجلی کی کرنٹ لگی ہو، اوپر اوپر کودتا رہتا۔ جس کی وجہ سے اس کے گھنے بال بکھر کر اوپر اوپر لہراتے رہتے تھے۔

سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کسی نے بھی اس کی فریاد نہ سنی۔ تقریباً دس پندرہ مرتبہ اس قیدی شخص کو چاقو اور چھری کی نوک سے زدوکوب کیا۔ پھر انتہائی سرعت کے ساتھ، ہاں پلک جھپکتے ہی اس قیدی شخص کے سر اور اس کے دونوں ہاتھوں کو کاٹ کر الگ کر

دیا۔اس نے قیدی کی کمر میں ایک رسی بھی باندھ رکھی تھی۔اس طرح وہ اس کے دھڑ کو اِدھر اُدھر لڑھکنے سے بچا رہا تھا۔تاہم سر اور دونوں ہاتھ کاٹ دیے جانے کے بعد بھی وہ قیدی زندہ تھا۔وہ اب بھی زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔اس کی روح اس کے جسم سے رضامندی سے نہ نکل رہی تھی۔وہ اِدھر سے اُدھر لڑھکتا تھا۔آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔پیچھے ہٹتا تھا، ایک طرف سے دوسری طرف مڑ مڑ جاتا تھا۔اس کی روح جسم سے نکلنے کے لیے پھر پھرا رہی تھی لیکن تماش بین اس پر ہنس رہے تھے، اور اس کے ''گناہگار!'' نے اس قیدی کی تڑپنے کو ''رقص بسمل'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔

وہ بہت دیر تک زندہ رہا اور تڑپتا رہا۔بہت دیر تک وہ اِدھر سے اُدھر جاتا رہا اور اُدھر سے اِدھر آتا رہا۔ابھی یہ تماشا اپنے اختتام تک بھی نہ پہنچا تھا کہ ہمارے رشتے دار تخت سے لڑھک کر نیچے آ گرے، اور حواس باختہ ہو گئے۔دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔سب نے مل کر اسے اٹھایا۔بہادری نے اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا، اور دعا کرنے لگا کہ اے اللہ اس کے ہم وطن کو کچھ نہ ہو۔پھر تیزی سے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کی چھینٹیں مارنے لگا۔لیکن ''بسمل رقص'' کا تماشا ابھی ختم نہ ہوا تھا۔تقریباً بیس منٹ ہو گئے تھے کہ وہ قیدی اب بھی تڑپ رہا تھا اور مسلسل کود رہا تھا۔ہاں وہ اب بھی کود رہا تھا!

ابھی مغرب کی اذان بھی نہ ہوئی تھی کہ میں ایک اسپتال میں اپنے اسی رشتے دار کے سرہانے میں غم و یاس کے عالم میں کھڑا تھا۔اس وقت فضا پر تاریکی چھا رہی تھی۔مجھے ٹھیک سے کوئی چیز دِکھائی بھی نہ دے رہی تھی۔بالآخر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ان کی آنکھیں بند تھیں۔جب میں نے کئی بار آواز دی تو ان کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔وہ بہت افسردہ افسردہ مجھے دیکھتے رہے۔وہ بہت کچھ مجھے کہنا چاہتے تھے، لیکن نہیں کہہ پا رہے تھے۔بڑی مشکل سے ان کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے:

''....میں نے....میں نے، میں نے وہ.... بسمل....رقص دیکھ لیا....''

میں آج صبح صادق سے ہی ان کے پاس بیٹھا تھا۔ان کی زبان سے پھر کوئی اور بات نہ نکلی۔ابھی آفتاب ٹھیک سے منور بھی نہ ہوا تھا کہ ہم لوگ ان کی لاش کو اسپتال سے لے کر گھر آئے۔سبھی رشتے دار و اقارب حیرت و استعجاب سے ان کی ناگہانی موت کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انھیں کیا بتاتا!؟

❑❑❑

'نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری....'

لکھنؤ میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ کا شہر ہے اور مجلس شام غریباں کے ساتھ ساتھ نواب سعادت علی خاں کے دور میں قائم کئے جانے والے شاہی محرم کے لئے مشہور ہے۔یہاں کی عزاداری اور عزائی مراسم کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔یہ لکھنؤ ہی کا خاصہ ہے کہ نوابین اودھ کے زمانے میں شروع ہونے والے شاہی محرم کی مجالس اور جلوس کا اہتمام و انتظام بڑی شان و شوکت، عقیدت اور احترام کے ساتھ آج بھی کیا جاتا ہے۔

'نیا دور' کا اکتوبر ۲۰۱۷ء کا شمارہ لکھنوی محرم کی شاہی عزائی تہذیب، نوحہ و مرثیہ گوئی اور سوز خوانی وغیرہ پر مبنی ہوگا۔اس شمارے میں میر تقی میر، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوق، جون ایلیا، حفیظ جالندھری، عرفان صدیقی اور افتخار عارف کے نوحے اور سلام کے ساتھ سید علی نقی نقوی، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، جعفر میر عبداللہ، ڈاکٹر عابد حیدری اور شاہد کمال کے مضامین بھی شامل کئے جائیں گے۔اس کے علاوہ ادب کے نوبل انعام سے سرفراز جرمن زبان کی ادیبہ ہیرٹا مئولر کے ناول کا اقتباس، مراٹھی ناول اینڈھن کی چھٹی قسط، ہندی کہانی اور دیگر تخلیقات بھی حسب دستور موجود رہیں گی۔

شامت اعمال

فضل حسنین
A-7، پترکار کالونی، اشوکت نگر، الہ آباد
موبائل: 7499178776

یوں تو ہم نے زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حماقت کی ہوگی لیکن ایک چوک ہم سے ایسی بھی ہوگئی جس کے لئے شاید ہمیں زندگی بھر پچھتانا پڑے۔ وہ چوک ہے اپنی بیگم کو کچھ ماڈرن بنانے کا خیال۔ ویسے تو بیگم شروع سے دیندار اور شرع کی پابند تھیں اس لئے شوہر کی نامعقول سے نامعقول بات کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی تھیں۔ ہم نے شروع میں ہی فرمان جاری کر دیا تھا کہ 'ہمارا تو زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا ہے اس لئے تم خالص گھریلو عورت بن کر رہو۔' لیکن شامت اعمال اپنے کچھ نئے دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر ہمیں اچانک یہ خیال آ گیا کہ بیوی کو کچھ ماڈرن ہونا ہی چاہئے۔

چنانچہ ایک دن ایک وی آئی پی کے یہاں منعقد تقریب میں جاتے وقت ہم نے بیگم کو ساتھ لے ہی لیا لیکن گھر واپس پہنچنے پر بیگم کا چہرہ کچھ اور کھلا ہونے کے بجائے خاصا بجھا سا نظر آیا۔ ہم نے دریافت کیا، 'کیوں جی! تقریب تمہیں کچھ جچی نہیں کیا؟' منھ مزید لٹکائے ہوئے موصوفہ نے جواب دیا، 'پورے وقت میں خود کو چورسی محسوس کرتی رہی۔'

ہمارا دل دھک سے ہو گیا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا، 'آج تمہارا پہلا بڑا فنکشن تھا، کہیں ہڑبڑاہٹ میں کوئی چمچہ ومچہ پرس میں تو نہیں ڈال لیا تھا؟' اس پر تو بیگم چراغ پا ہوگئیں اور بولیں، 'میں کوئی رائٹر وائٹر تو ہوں نہیں جو خواہ مخواہ اس طرح کی الٹی سیدھی حرکتیں کر کے خود کو فلاسفر ظاہر کرنے کی کوشش کرتی پھروں۔'

ہم دل ہی دل میں کٹ کر رہ گئے اور خفت مٹانے کی غرض سے بولے، 'ارے بھئی، میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا، بتاؤ نہ، کیا ہوا؟'

> یہ سوال ہمارے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ ہم تو میک اپ کے نام پر ابھی تک صرف سرسوں کا تیل ہی چہرے پر ملتے آئے تھے۔ بات بناتے ہوئے بولے، 'تمہیں اب یہ بھی بتانا پڑے گا، ارے جو جو آئٹم آج کل چلن میں ہو، پیک کر دو!' اتنا کہتے ہوئے ہم جلدی سے آگے بڑھ لئے کہ کہیں اس سلسلے میں دکاندار کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے کیونکہ اس معاملہ میں ہم بالکل کورے تھے۔
>
> واپسی میں جب ہم دکان پر پہنچے تو دکاندار بولا 'بابو جی! کوئی رکشہ تو بلا لیجئے پہلے!'
>
> ہم نے قدرے چونکتے ہوئے پوچھا، 'راشن واشن بھی باندھ دیا ہے کیا؟'
>
> وہ مسکراتے ہوئے بولا، 'نہیں بابو جی! آج کل میک اپ کے اتنے آئٹم آنے لگے ہیں کہ ایک ایک پیس (عدد) میں ہی اچھا خاصا بوجھ ہو گیا۔'
>
> چونکہ ہم نے اتنی اکڑ کے ساتھ آرڈر دیا تھا کہ اب 'بوجھ' کچھ ہلکا کرا لینے کی ہمت نہ پڑی۔

آنکھوں میں آنسو کے موٹے موٹے قطرے تیراتے ہوئے بولیں، 'ساری عورتیں بس مجھے ہی تکے جا رہی تھیں، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔'

ہم نے بات برابر کرنے کی کوشش میں کہا، 'بھئی، تمہارا چہرہ ہے ہی اتنا پرکشش کہ لوگوں کی نگاہیں تم پر ٹک جاتی رہی ہوں گی۔'

تنک کر بولیں، 'بس بس! بہت بنایا مت کیجئے! اتنا تو میں سمجھتی ہی ہوں۔' ساری عورتیں اتنی بن سنور کر آئی تھیں جیسے جھانکی کی مورتیاں، بس ایک میں ہی ایسی تھی کہ آنکھوں میں کاجل، سرمہ تک نہ تھا۔

ہم نے ہمت نہ ہارتے ہوئے کہا، 'تمہاری آنکھیں تو یونہی کٹار جیسی ہیں۔ ان میں کاجل سرمے کے لئے گنجائش ہی کہاں ہے؟ بھئی وہ سب تمہارے فطری حسن پر ہی تو فدا ہو رہی تھیں۔'

ہماری چاپلوسی کا بیگم پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ 'آپ کی ان لچھے دار باتوں سے میں اب تک بہلتی رہی مگر اب میں میک اپ کئے بغیر کسی فنکشن میں بلکہ یوں بھی گھر سے باہر نہ نکلوں گی۔'

بیگم کے لہجہ میں آج اتنی خود اعتمادی تھی کہ ہم نے سوچا کہ اب اس سلسلہ میں مزید وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ ان کے میک اپ کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔

باقاعدہ میک اپ کے لئے ہمیں نئے سرے کا بندوبست کرنا تھا۔ چنانچہ جنرل اسٹور جہاں سے ہمارے گھر کا سامان آیا کرتا تھا، پہنچ کر دکاندار سے بولے، 'بھئی ذرا میک اپ کا سامان تو پیک کر دینا۔'

دکاندار نے ہمیں یوں دیکھا جیسے آج ہمارے

سر میں سینگ نکل آئے ہوں۔ ہم نے کچھ اور شان سے کہا، 'سمجھے نہیں کیا؟'

وہ بولا، 'بابو جی! آج سورج پچھّم سے نکل رہا ہے؟ آج تک تو آپ نے یہ نیک کام کیا نہیں!'

ہم نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا، 'تم سے جو کہا ہے وہ کرو! میں ذرا جلدی میں ہوں۔'

اس نے پوچھا، 'کیا کیا پیک کردوں صاحب؟'

یہ سوال ہمارے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ ہم تو میک اپ کے نام پر ابھی تک صرف سرسوں کا تیل ہی چہرے پر ملتے آئے تھے۔ بات بناتے ہوئے بولے، 'تمہیں اب یہ بھی بتانا پڑے گا، ارے جو جو آئٹم آج کل چلن میں ہو، پیک کردو!' اتنا کہتے ہوئے ہم جلدی سے آگے بڑھ لئے کہ کہیں اس سلسلے میں دکاندار کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے کیونکہ اس معاملہ میں ہم بالکل کورے تھے۔

واپسی میں جب ہم دکان پر پہنچے تو دکاندار بولا، 'بابو جی! کوئی رکشہ تو بلا لیجئے پہلے!'

ہم نے قدرے چونکتے ہوئے پوچھا، 'راشن واشن بھی باندھ دیا ہے کیا؟'

وہ مسکراتے ہوئے بولا، 'نہیں بابو جی! آج کل میک اپ کے اتنے آئٹم آنے لگے ہیں کہ ایک ایک پیس (عدد) میں ہی اچھا خاصا بوجھ ہو گیا۔'

چونکہ ہم نے اتنی اکڑ کے ساتھ آرڈر دیا تھا کہ اب 'بوجھ' کچھ ہلکا کرا لینے کی ہمت نہ پڑی اور ہم نے بھی 'بھان متی کا پٹارہ' لاکر بیگم کے قدموں میں اس طرح ڈال دیا جیسے ان کی خواہش پر آج ہم نے خود کو قربان کر دیا ہو۔

اس وقت بیگم کسی رسالے کے مطالعہ میں اس طرح غرق تھیں جیسے کسی امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ بالآخر ادب سے دلچسپی پیدا ہو ہی گئی لیکن غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ان رسائل میں سے ایک تھا جو صرف فیشن اور میک اپ سکھانے کے لئے ہی شائع کئے جاتے ہیں۔

بہرحال بیگم کی امانت ان کے حوالے کرتے

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

ہوئے کہا، 'شام کو ایک فنکشن میں چلنا ہے' اور اپنے کمرے میں آکر لکھنے میں مشغول ہو گئے۔

شام ہوئی تو کسی کے قدموں کی آہٹ پر ہم نے نظریں اٹھائیں تو کوئی عورت کھڑی نظر آئی۔ ہم نے جلدی سے نظریں نیچی کر لیں کیونکہ بیگم نے ہمیں سب سے پہلا سبق یہی دیا تھا کہ پرائی عورت کو غور سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ہم نے پوچھا، 'مجھ سے کوئی کام ہے آپ کو؟'

جواب ملا، 'جی!'

ہم نے نہایت سنجیدگی سے کہا، 'فرمایئے!'

خونخوار لہجے میں سوال کیا گیا، 'ڈراما لکھتے لکھتے آپ ڈراما کرنے بھی لگے کیا؟'

ہمیں جیسے کرنٹ سا لگ گیا کیونکہ یہ ہماری بیگم ہی تھیں جو اس وقت اتنی عجیب سی لگ رہی تھیں کہ پہلی نظر میں ہم انہیں پہچان ہی نہ سکے۔

ہم نے حیرت سے پوچھا، 'پہلے آواز بدل کر کیوں نکالی تھی تم نے؟ ورنہ میں آواز ہی سے پہچان لیتا۔'

فرمایا، 'لپ اسٹک خراب نہ ہو جائے، اس ڈر سے پورا منھ کھولا ہی کہاں تھا میں نے۔۔۔ لیکن آپ بھی آخر اتنا طویل جملہ بلوا کر ہی مانے۔'

اب آپ خود سوچئے ہم پر کیا گزری ہوگی؟ کیونکہ جتنا وقت میک اپ کرنے میں صرف ہوا تھا، اس سے زیادہ وقت میک اپ کو 'نارمل' کرنے کے لئے درکار تھا۔

بیگم نے دل کی حسرت پہلی بار میں ہی نکال ڈالی تھی۔ اس لئے اس روز تو ہمیں اپنا پروگرام منسوخ ہی کرنا پڑا لیکن اب کہیں جانا ہوتا ہے تو پہلے بیگم کو بیوٹی پارلر لے جانا پڑتا ہے کیونکہ موصوفہ نے یہ کام اس عمر میں پکڑا ہے جب کوئی نیا کام سیکھ پانا اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔

اور یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ مہینے بھر کا جو خرچہ اب ہوتا ہے اس میں سے آدھے سے زیادہ رقم کمبخت اسی میک اپ کے مد میں جاتی ہے۔

❑❑❑

مشہور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کہا کرتے تھے کہ اسی طالب علم کو اسکالر کہلانے کا حق ہے جسے اساتذہ کے کم از کم دس ہزار اشعار ازبر ہوں اور وہ ان کا موقع اور محل پر استعمال کرنے کا ہنر رکھتا ہو۔ ڈاکٹر علوی کے مطابق اشعار کے برمحل استعمال کی صلاحیت رکھنے والے شخص کے ذہنی معیار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ مطالعہ کتنا عمیق ہے۔

اشعار کے برمحل استعمال کی صلاحیت آتی کہاں سے ہے، کئی اساتذہ کا خیال ہے کہ اس کے لئے ایک مخصوص ذہنی میلان کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ میلان در اصل اس خلاقیت کا پروردہ ہوتا ہے جو صرف مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ کی صحبت سے بھی ہمارے رویوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

'برمحل اشعار' دراصل ایک الگ خاصہ تو ہے ہی لیکن یہ ایک الگ موضوع بھی ہے، یہ پتہ چلتا ہے خلیق الزماں نصرت کی تصنیف 'برمحل اشعار اور ان کے مآخذ' سے۔ اس کتاب سے پہلے ایسی کوئی کتاب اردو میں غالباً نہیں آئی ہے جس میں برمحل اشعار کا اتنا عمدہ اور بلیغ مجموعہ شائع ہوا۔ وہ اشعار جو ایک زمانے تک ضرب المثل کے طور پر سنے گئے، محاوروں کے طور پر استعمال ہوئے، ان سب کو یکجا کر ایک کتابی شکل میں پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

ہندوستان کی درجنوں یونیورسٹیوں، درجنوں اداروں اور سیکڑوں کی تعداد میں اردو کے لئے کام کر رہی تنظیموں میں سے کسی نے بھی اس موضوع پر نہیں سوچا۔ یہ کتاب جو خلیق الزماں نصرت نے تیار کی ہے، یہ در اصل ایک بڑا پروجیکٹ ہے اور نہ جانے انہوں نے کیسے تنہا اسے انجام تک پہنچا دیا۔ ایک ایک شعر کا ماخذ تلاشنا، اس کے معنی، اس کی وضاحت، ترتیب و حوالے دینا کسی ایک آدمی کے بس کا کام لگتا تو نہیں ہے لیکن اسے خلیق الزماں نے کر دکھایا۔ اس کتاب میں مجموعی طور پر ۱۳۰۰/ برمحل اشعار شامل کئے گئے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔

عام طور پر ہر کتاب کے لئے لکھا جانے والا جملہ کہ 'یہ کتاب اردو میں بیش قیمت اضافہ ہے' اسی کتاب پر صادق آتا ہے۔ فہرست سازی کے ساتھ ولی دکنی سے لے کر بشر بدر تک ایک ردیف کے کئی کئی اشعار انہوں نے اس میں شامل کئے ہیں۔

یہ شاید اسی کتاب کی دین ہے کہ 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں' جسے بہادر شاہ ظفر کا سمجھا جاتا تھا، وہ مضطر خیر آبادی کا نکلا۔ اس کی وضاحت کے طور پر خلیق الزماں نے صفحہ ۳۰۷ پر لکھا ہے کہ فلم 'لال قلعہ' میں یہ غزل محمد رفیع کی آواز میں گائی گئی اور جاں نثار اختر مضطر خیر آبادی کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے صابردت کے فن و شخصیت کے غزل نمبر میں یہ غزل شامل کی تھی۔ نادم سیتاپوری اور جاں نثار اختر نے اس کی تائید کی۔

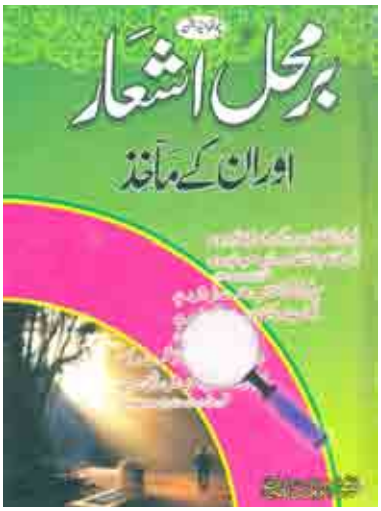

مصنف : خلیق الزماں نصرت
مبصر : زیبا پروین
قیمت : 76 روپئے
ناشر : کائنات پبلیکیشنز، بھوینڈی، ممبئی
ملنے کا پتہ : رضوی کتاب گھر، مٹیا محل، دہلی۔ ۶

کہا جاتا ہے کہ ظفر کا کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی ہے اور سینہ بہ سینہ روایت ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو روایت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر آنکھیں بند کر کے مان لینا اہل ذوق و ارباب نظر کے لئے تو ممکن نہیں ہے۔

اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ 'وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا، پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی' یہ شعر فکر یزدانی رامپوری کا ہے۔

مشہور زمانہ شعر سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے، آزادی کے متوالوں کی زبانوں پر تھا۔ اکثر لوگ اس شعر کو رام پرساد بسمل سے منسوب کرتے ہیں جب اس کتاب سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رام پرساد بسمل بھگت سنگھ کے چودہ ساتھیوں میں سے ایک تھے مگر شاعر نہیں تھے۔ وہ بسمل عظیم آبادی کا ہی شعر پڑھتے تھے۔ وہ پھانسی سے قبل تک یہ غزل پڑھا کرتے تھے چونکہ ان کا تخلص بھی بسمل تھا اس لئے لوگوں نے سمجھا کہ یہ غزل ان ہی کی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل ۱۹۲۱ء میں یہ غزل بسمل کے قلم سے نکلی اور اس کے اشعار نے کلکتہ کی کانگریس کانفرنس کے لوگوں کے دلوں میں آگ بھڑکانے کا کام انجام دیا۔

مذکورہ اشعار کے علاوہ متعدد ایسے اشعار کا ذکر بھی کیا ہے جو کسی دوسرے مشہور شاعر کے نام سے منسوب تو ہیں مگر در اصل اس کا اصلی شاعر کوئی دوسرا ہے۔ قارئین اور اردو داں طبقہ کو جب شعر کے اصلی شاعر کا علم ہوگا تو تعجب نہیں کہ یہ ان کے علم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حیرت میں بھی اضافہ کا سبب بنے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف محکموں میں وقوع پذیر ہونے والے برمحل اشعار بھی درج ہیں۔ ان اشعار کا انطباق نصرت نے اس طرح کیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اشعار اسی موقع و محل کے لحاظ سے شاعر نے کہے تھے۔

یہ کتاب برمحل اشعار کا انسائیکلو پیڈیا ہے اور اردو دنیا کے لئے آنے والے وقتوں میں ایک بہت بڑی نعمت کے طور پر اسے شمار کیا جائے گا۔ برمحل اشعار کی اس زنبیل میں ولی دکنی کے ایسے تمام شعر شامل ہیں جو ان کے انتخاب میں بھی شاید نہیں ہیں۔ جیسے آبرو کا یہ شعر 'تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے، کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے' ان کا صرف یہی شعر اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں شعراء اور حوالہ جات کی پوری فہرست اور دیگر تفصیل موجود ہے۔

خلیق الزماں نصرت نے اس قابل مطالعہ کتاب سے مزید تحقیق کے باب وا کر دئے ہیں۔ انہوں نے جو منفرد بحثیں کی ہیں اور معلومات فراہم کی ہیں، ان موضوعات پر الگ الگ ریسرچ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

❑❑❑

''ماہنامہ آجکل'' کا ڈائمنڈ جبلی نمبر اپنی پرانی روش سے ہٹ کر ایک نئے روپ سروپ کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، یہ دیدہ زیب بھی ہے، اور اس کے تمام تر مشمولات کے ابواب بندی میں بھی مدیرانہ صلاحیت سے کام لیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان مشمولات کو جگہ دی گئی ہے جو بذات خود ''ماہنامہ آجکل'' کی ادبی وصحافتی خدمات سے متعلق ہیں، جن میں ''حق نی القاسمی، مشرف عالم ذوقی، انیس امروہوی، ڈاکٹر محمد کاظم ودیگران اہل قلم نے ''ماہنامہ آجکل'' کی خدمات کو موجودہ عہد کے تناظر میں ایک منفرد زاویہ انفراد کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یادرفتگاں کا کالم حسب معمول اپنی پرانی روایت کے ساتھ ہی آگے بڑھ رہا ہے، جس کے اپنے کچھ مخصوص قارئین ہیں۔ دیگر مقالات کے عنوان کے تحت شائع ہونے والے مضمون مختلف نوعیت کے حامل ہیں، ان میں کچھ مضامین بہت اچھے ہیں، جن کے مطالعہ سے قارئین کو یقینا کچھ نہ کچھ استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔ ''ادبی اڈہ'' یہ ایک اچھی کوشش ہے، اور اس کے ضمن میں شایع ہونے والے مضمون بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ''کہانی'' والے باب میں شائع ہونے والے افسانے اور کہانیاں کچھ تو اپنے روایتی انداز کی تاسی کر رہی ہیں۔ لیکن ایک دو افسانے ایسے ضرور ہیں جو یقینا اپنے قاری کے ایک نئے پن کا احساس دلانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ ''لیکن اس باب کے عنوان ''کہانی'' سے مجھے ذاتی طور پر اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کا عنوان واحد (کہانی) کے بجائے جمع کا صیغہ (کہانیاں) ہوتا تو زیادہ مناسب اور بہتر تھا۔ اس رسالے میں ''شکاریات'' والا عنوان بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے، لیکن مزید اچھا ہوتا اگر اس عنوان کے تحت کم از کم دو مضمون یا اس کے متعلقات کو جگہ دی جاتی۔ منظومات کے گوشہ میں کوئی خاص نیا پن نہیں ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ موجودہ عہد میں اچھی شاعری کا بحران ہے، یا میرے خیال سے جو اچھے تخلیق کار ہیں وہ اپنی تخلیقات کو کسی ادبی رسائل میں شائع کروانے میں تساہلی برتتے ہیں، اس کی اور بھی دیگر وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اس کے آخر میں تبصرہ اور خطوط کا سلسلہ تقریبا ہر رسالہ کا ایک روایتی اختصاص ہے جسے بہرصورت میں باقی رکھنا ضروری ہے۔

اس پورے نیم تجزیاتی تبصرے میں ''ماہنامہ آجکل'' کے ڈائمنڈ جبلی نمبر کے عنوان ''آجکل کے معاصر رسائل'' پر میں مدیر سے اختلاف نظر رکھتا ہوں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں دو ہی ایسے ادبی رسالے ہیں جو اردو زبان کی باضابطہ نمائندگی کرتے ہیں۔ اس میں اتر پردیش حکومت کا اردو ماہنامہ 'نیادور' بھی شامل ہے جسے کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا، یہ بات درست ہے کہ ماہنامہ 'آجکل' اپنی عمر میں ماہنامہ 'نیادور' سے صرف تین سال بڑا ہے، لیکن اس کی وجہ سے ''نیادور'' کو 'آجکل' کے معاصر میں شمار نہ کرنے کا کوئی منطقی جواز کم از کم مجھے تو نظر نہیں آرہا ہے۔ آج کل کے بعد نیادور ہندوستان کا وہ واحد رسالہ ہے جو گزشتہ ۷۲ ربرس سے متواتر شائع ہو رہا ہے اور اس کے کئی خصوصی شماروں نے عالمی سطح پر

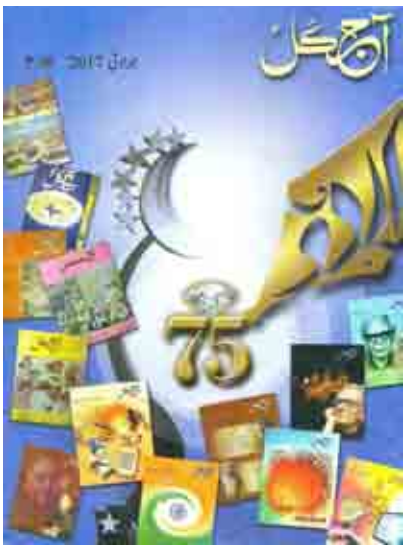

ایڈیٹر : ابرار رحمانی
مبصر : شاہد کمال
قیمت : 30 روپے
ناشر : پبلیکیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، نئی دہلی

پذیرائی حاصل کی ہے۔ 'نیادور' شمالی ہندوستان کا واحد رسالہ ہے جس نے دبستان لکھنؤ کی روایات کی پاسداری میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ حیران کن ہے کہ 'آج کل' کے معاصر رسائل میں ایڈیٹر آجکل نے معارف اور دین و دنیا جیسے رسائل کو تو شامل کرلیا لیکن نیادور سے انہوں نے پرہیز کیا۔ 'نیادور' کو محض اس لئے تو نہیں نظر انداز کیا گیا کہ آجکل کے مقابل صرف وہی حریف ٹھہرتا ہے۔ بہرحال جو بھی وجہ رہی ہو، یہ بات کسی کے بھی گلے نہیں اتر رہی ہے۔

چونکہ دہلی اور لکھنؤ اردو زبان و ادب کے دو ایسے دبستان ہیں، جن کے ادبی معروضات ہماری زبان کی تہذیب وثقافت کی ایک ایسی اساس ہیں، جن کے تذکروں کے بغیر ہمارا، اردو ادب کبھی مکمل نہیں ہوسکتا۔

اس ڈائمنڈ جبلی نمبر میں ایک اور خامی جو بڑی روشن اور واضح طور سے نمایاں ہورہی ہے، وہ یہ کہ اپنی علاقائی ترجیحات کی بنیاد پر اتر پردیش جیسی ریاست سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں خاص طور پر بھوج پوری سماج پر ایک مضمون شامل کیا گیا جس میں ساہوکاری اور صارفیت کو موضوع گفتگو بنایا گیا لیکن پوری دنیا میں اپنی تہذیبی اور ادبی وراثت کے لئے مشہور لکھنؤ، جس نے اردو زبان و ادب کے علاوہ رقص وموسیقی کے نئے نئے روپ ایجاد کئے، اسے فراموش کر دیا گیا۔ پٹنہ کے بک امپوریم کو اگر عاشقان اردو کا اڈا قرار دیا جاسکتا ہے تو لکھنؤ کے امین آباد میں واقع 'دانش محل' کے لئے کوئی جگہ اس میں کیوں نہیں رکھی گئی۔ حیدرآباد دکن، ممبئی اور کلکتہ کے اردو مراکز کا ذکر کئے بغیر صرف بک امپوریم پر اتنی مہربانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

دہلی کی جامع مسجد کے اردگرد اردو کے بے شمار گمنام اڈے ہیں جہاں اردو گڑھی جاتی ہے۔ ان قدیمی اڈوں سے اردو کے سیکڑوں ادیب وشاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ اردو کے ہزارہا محاورے انہیں اڈوں کی دین ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے لے کر جامعہ نگر اور اس کے گردو نواح کے علاقوں میں بھی اب اردو کے نئے نئے گوشے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر صرف پٹنہ کے بک امپوریم پر اتنی توجہ حیران کرنے والی ہے۔

اس سے پہلے بھی جب ماہنامہ 'آجکل' نے غالباً 'صحافت' پر ایک گوشہ شائع کیا تھا تو اس کے سرورق پر دیگر رسائل کی تصویر تو دی گی تھی لیکن وہاں پر بھی ''نیادور'' سے تجاوز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس طرح کی ارتجالی مجہولیت کے مستقل تکرار سے قارئین کے ذہن میں اس طرح کے سوالات اٹھنا لازمی ہیں۔ لہٰذا ہر دو صورت میں اس طرح کے غیر منصفانہ رویہ سے پرہیز کرنا ایک اچھے مدیر کا امتیازی نشان ہونا چاہئے۔ مجھے اسوقت میر انیس کا ایک شعر یاد آرہا ہے جسے میں اپنے قارئین کی خدمت میں نظر کرنا چاہتا ہوں۔

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

❑❑❑

آپ کے خطوط

عرصۂ دراز کے بعد ''نیادور'' کے تین شمارے تسلسل کے ساتھ موصول ہوئے تو حیرت انگیز مسرت کا احساس ہوا۔خدا کرے یہ تسلسل جاری رہے۔تینوں شماروں کی ترتیب وتزئین اور آپ کے اداریوں سے اندازہ ہوا کہ آپ نئے جوش وخروش کے ساتھ نیادور کو نیا رنگ وآہنگ عطا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ جہاں مضامین میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کی گئی ہے وہیں گذشتہ لکھنؤ ،علاقائی ادب اور غیر ملکی ادب سے مختلف تہذیبی وراثتوں کے تحفظ پر سنجیدہ کوشش کا اظہار ملتا ہے۔تازہ شمارے میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر پر مضامین قابل توجہ ہیں تو افسانوں میں ذوقی اور مسرور صغریٰ کے افسانوں میں دلچسپی کے پہلو زیادہ ہیں۔مرزا جعفر حسین نے اودھ پنچ کے معاصر جرائد میں پیام یار، دل گداز، الناظر ،سچ،صدق اور ہمدم وغیرہ سے متعارف کروا کر ہمیں نئی معلومات سے بہرہ ور کیا ہے۔شعری نگارشات میں بھی زیادہ تر تخلیقات قابل مطالعہ ہیں۔مختصر یہ کہ تازہ شمارہ صوری ومعنوی طور پر دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں نیادور نئی بلندیاں اور کامرانیاں حاصل کرے گا۔

شہاب ظفر اعظمی

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اگست کا نیا دور پہلے سے بہتر لگا خاص کر صبیحہ انور کے مضمون 'عصمت چغتائی کا فن' اور عصمت چغتائی کی لکھنؤ آمد؛ یادیں اور ملاقاتیں۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے میں بھارتی سے ممتاز صبیحہ انور اور آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ عصمت چغتائی پر اتنے اچھے اور چنندہ مضمون وتصویریں شائع کیں کہ عصمت کی روح کو سکون اور آپ دونوں (ایڈیٹر اور ڈاکٹر صبیحہ انور) ثواب سے یقیناً مالا مال ہوئے ہوں گے۔ ساتھ ہی ان کی یہ شکایت بھی ختم ہوگئی ہوگی کہ 'زندگی اتنی لمبی نہیں ہے۔ہم ہر روز ختم ہو رہے ہیں، کون یاد کرے گا ہمیں، کس کو فرصت ہے۔' دیکھئے عصمت جی! نیا دور کو کور پیج سے لے کر آخر تک ایڈیٹر اور ڈاکٹر صبیحہ انور نے آپ کی یادوں سے مہکا دیا ہے۔

رشید احمد صدیقی (بہرائچ)

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں نے اکثر تخلیقات نیا دور کو بھیجی ہیں اور ان کی اشاعت بھی ہوئی ہے۔ یہ جاننے کے بعد مسرت ہوئی کہ آپ نے اس ادارے کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔آپ سے بھی بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آنے والوں وقتوں میں بیحد پذیرائی ہوگی۔ نیادور کے تازہ شمارے دیکھنے کے بعد آپ کا جدید رنگ وآہنگ پسند آیا۔میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

شاہد اختر، گیا کالج، بہار

'نیادور' کا تازہ شمارہ مفید اور وقیع

'نیادور' کے اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے سے متعلق روزنامہ آگ میں شائع ہونے والا تبصرہ (۲۵/اگست ۲۰۱۷ء)

کل ڈاک سے آپ کا خوب صورت عطیہ (نیادور کے تین حالیہ شماروں کی شکل) موصول ہوکر نظر نواز ہوا۔ آپ کی توجہ فرمائی کے لئے اظہار شکریہ کرتا ہوں۔ گو عمر کی اس ڈھلان پر اور خصوصاً گھر میں تنہا ہونے کی وجہ سے کئی غیر ادبی کاموں میں مصروف ہونے کے باعث اب لکھنا پڑھنا بہت محدود ہوکر رہ گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے یقیناً مستفید اور خوش وقت ہوں گا۔

مہندر پرتاپ چاندؔ، انبالہ (ہریانہ)

اگست ۲۰۱۷ء کا شمارہ موصول ہوا۔سرورق دیکھ کر ہی دل شاد ہوگیا۔ بیحد شاندار اور دیدہ زیب۔عصمت چغتائی پر کافی دنوں پر ایسا مواد سامنے آیا جو مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔اس سلسلہ میں قاضی عبدالستار کے تاثرات اور شمیم حنفی کا انٹرویو بیحد اہم ہے۔صبیحہ انور نے کافی قریب سے عصمت چغتائی کو دیکھا ہے اور صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنی تحریر میں ان کی زندگانی اور اپنے تجربے بہترین طرزِ تحریر میں پیش کئے ہیں۔ پڑھ کر کافی لطف آیا۔ٹیڑھی لکیر اور کاغذی ہے پیرہن پڑھ کر اچھا لگا لیکن یہ محسوس ہوا کہ اس میں کافی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔دل نہیں بھرتا۔ باقی میگزین بھی لائق مطالعہ ہے۔

مناظر حسن، جلالپور امبیڈکر نگر

ماہ اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں گوشۂ عصمت چغتائی اور پروفیسر نیر مسعود صاحب سے متعلق آپ کی جو پیشکش ہے، اس سلسلہ میں کافی عرق ریزی کی گئی ہے جو صاف ظاہر ہوتی ہے۔ مدتوں بعد لائق مطالعہ مواد فراہم ہوا ہے۔ رتن سنگھ کی نظمیہ کہانی ایک بہترین تجربہ ہے۔ ملک کی آزادی سے متعلق دونوں مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ داخلی کور پر اردو ادیبوں کی ولادت ووفات کا باقاعدہ ذکر بہترین کوشش ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ پورے سال کی معلومات فراہم کرے گا۔ اگست میں شائع ہونے والے دونوں تبصرے اور غیر ملکی ادب کی کہانی عصری تقاضوں کی تکمیل کرتی نظر آتی ہے۔

سیف زیدی، اعظم گڑھ

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک عیدالاضحیٰ کے موقع پر لکھنؤ کی عیش باغ عیدگاہ میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے (۲؍ستمبر ۲۰۱۷ء)

جنگ آزادی کے دوران انڈمان نکوبار کی سیلیولر جیل میں مجاہدین آزادی کو انگریزوں کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں دی گئیں تھیں۔ گورنر جناب رام نائیک بطور پٹرولیم منسٹر جب وہاں گئے تو انہوں نے سیلیولر جیل میں جنگ آزادی کے سورماؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے امر جیوتی کی تعمیر کرائی۔

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک 'راج بھون میں رام نائیک؛ تیسری سالانہ رپورٹ'
کا اردو اور ہندی ایڈیشن اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کو پیش کرتے ہوئے (۲۲/جولائی ۲۰۱۷ء)

वर्ष : 72 अंक 06
सितम्बर 2017
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद